جونوری ۱۹۵۸ء

رجسٹر نمبر ایل ۵۳۴۰

شوال ۷۷ھ

جلد ۵۰ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

تحریک اسلامی
دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابلہ میں
از

نعیم صدیقی

مغرب کی جدید تہذیب الحاد، سرمایہ دارانہ جمہوریت، سوشلزم اور فاشزم جیسی تحریکات نے اب تک انسان کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہیں ۔ انسانی معاشرے میں کسی طرح کی اصلاح کے بجائے عظیم فساد پیدا ہوگیا ہے ۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے جو حل پیش کیا ہے ۔ وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے ۔ مصنف نے اس کتاب میں موجودہ دور تہذیب کے نظریات و تحریکات کا تفصیلی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ ان نظریات میں کیا کیا مفاسد ہیں اور انسانیت کے لئے اسلام ہی کیوں راہ نجات ہے ۔

ضخامت ۸۴ صفحات　　　　قیمت ۰ - ۲ - ۱

ہماری دوسری نئی مطبوعات

۱ ۔ اپنی اصلاح آپ از نعیم صدیقی

یہ انفرادی تعمیر سیرت اور تزکیہ نفس کے موضوع پر نعیم صدیقی صاحب کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جو تقریر کی شکل میں جماعت اسلامی حلقہ لاہور کے ایک ہفتہ وار اجتماع میں پیش کیا گیا تھا ۔

۳۶ صفحات　　　　قیمت ۶ - ۶ - ۰

۲ ۔ ہاتھیوں والے　مصنفہ محمد عبدالحی
۳ ۔ باغ والے　　"　　"
۴ ۔ انقلاب　　"　　"
۵ ۔ خاموش تبلیغ　　"　　"

یہ کتابچے ادارہ الحسنات رامپور کے شائع کردہ بچوں کے سیٹ کی کڑیاں ہیں جو پہلی مرتبہ شائع کی جا رہی ہیں ۔

قیمت ۶ - ۶ - ۰ فی کتابچہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

و سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی زیر مسلم مسجد

چوک انارکلی ۔ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۰	بابت ماہ جولائی ۱۹۵۸ء	عدد ۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کی کسی گزشتہ اشاعت میں ہم نے خدا اور بندے کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ایک مومن و مسلم کی بنیادی صفت مالک الملک کے حضور میں تسلیم و رضا ہے۔ ایک انسان جب اللہ پر ایمان لاتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی بندگی اور بیچارگی کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اب وہ اپنی زندگی کی ساری خواہشات کو مرضیاتِ الٰہی کے تابع کر دیگا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے عمر بھر ہمت آزما رہے گا۔ یہی چیز اس کی زندگی کی غایت اولیٰ ہو گی۔ آج ہم اسی سلسلۂ بحث کی دوسری کڑی یعنی مسلمان اور اس کے ہادیٔ برحق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر گفتگو کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا ادب و احترام نہ کرے، اُن کے سچے پیغمبر ہونے پر یقین نہ رکھے اور اُن سے تعلق خاطر کو ایمان کا ایک نہایت ضروری جزو نہ سمجھے۔ جو کوئی بھی اللہ کے فرستادوں سے کوئی کد رکھتا ہے، اُن کے خلاف اپنے سینے میں کوئی معمولی سے معمولی بغض و عناد پالتا ہے، جو اُن کی شانِ اقدس میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہنے کی جسارت کرتا ہے، وہ دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہے۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ بفحوائے "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" اور بتقاضائے ختمِ نبوت ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بعض خصوصیات کے حامل ہونے کے لحاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک منفرد اور امتیازی شان رکھتے ہیں۔ حضور سید الانبیاء کی بعثت سے پہلے جتنے پیغمبر گزرے ہیں اُن کی سیرتوں کا مقصد کسی ایک قوم کو خاص مدت تک رہنمائی دینا تھا۔ ایک زمانہ کے بعد تدریج اُن کے نقوش مدھم ہوتے گئے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ

دنیا سے بالکل ناپید ہو گئے اور اُن کی حقیقت افسانوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

ان اولوالعزم انبیاء کی زندگیوں کے برعکس حضور ختم الرسل کی حیاتِ طیّبہ کا معمولی سے معمولی واقعہ آج بھی تاریخ کی پیشانی پر اُسی طرح درخشندہ اور تابندہ ہے جس طرح کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا اور انسانیت کے قافلے اب بھی جب کبھی حضورؐ کے نقشِ حیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اُن کی تازگی دیکھ کر فوراً پکار اُٹھتے ہیں

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اس حوادث آباد عالم کا تغیر و تبدّل جس طرح اپنے سارے انقلابات کے باوجود خدا کی خدائی کو کسی طرح متاثر نہیں کر سکتا۔ وہ آج بھی اُسی طرح قائم و دائم ہے جس طرح لاکھوں کروڑوں سال پہلے تھی بالکل اسی طرح حضورؐ کی رسالت پر بھی گردشِ لیل و نہار کسی جہت سے اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ کی نبوت بھی زندہ جاوید ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گی۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد نجات کی اب صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ انسان اپنے دلوں کو مشکوٰۃِ نبوت سے منور کریں۔ آنحضرت کے بعد اگر کوئی شخص اُن کی نبوت کے علاوہ کسی دوسری نبوت کا قائل ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کے دل میں شمعِ ایمان فروزاں نہیں بلکہ دجل و فریب کی وہ چنگاری روشن ہے جو شیطان انسانوں کے خرمنِ ایمان کو خاکستر کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً جلاتا رہتا ہے۔ انسانیت کی فوز و فلاح اب صرف سرورِ کائنات کی غلامی میں ہے۔ یہی ایک طوق ہے جس کو پہن کر وہ دنیا اور آخرت میں سرفراز ہو سکتا ہے۔ یہی اُس کی سب سے قیمتی متاع ہے اور اسی پر ایک بندۂ مومن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرہ۔ رکوع ۱)	جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۔

پانے والے ہیں۔

اے محمد! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر جو اللہ اور اُس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔

یہ دو آیات اس امر کی پورے طور پر صراحت کر رہی ہیں کہ فلاح اور ہدایت صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو خدا اور اُس کی کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں۔ اُن پر ایمان لائے بغیر نہ کوئی راہ راست پر ہو سکتا ہے اور نہ ہی فلاح پا سکتا ہے۔

اس ضمن میں پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معنی صرف یہ نہیں کہ حضور کے رسول ہونے کا محض زبان سے اقرار کر لیا جائے۔ حضور کی رسالت پر ایمان کے بہت سے مضمرات ہیں۔ اس ایمان کی اصل روح یہ ہے کہ ہمیں حضور کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہو۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہو کہ آپ صادق اور امین ہیں، آپ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت اور دانائی ہے خواہ وہ حکمت اور دانائی ہماری سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ آ رہی ہو، آپ نے جو راہ انسانیت کو دکھائی ہے صرف اُسی پر چل کر انسانیت کامیاب و کامران ہو سکتی ہے، آپ نے نوعِ بشری کو زندگی کے جو اصول دیئے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور سخت نامراد ہے وہ انسان جو ان سے صرفِ نظر کر کے چلتا ہے۔ جب تک آدمی کے اندر حضور کی ذات کے بارے میں اس قسم کا غیر متزلزل اعتماد نہ پیدا ہو، مجرد یہ کہہ دینے سے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کا قرآن مجید میں ان الفاظ میں

اظہار کیا گیا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمد) وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ (تمہارے فیصلے کو) سر بسر تسلیم کر لیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

اور مسلمانوں کا قول جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے یہ ہے کہ (خوشی خوشی) کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اسی چیز کو حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا

ایمان کا مزہ اس نے چکھا جو اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔

اسی سلسلہ میں حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کبھی کبھی ہم یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بڑی دلپسند معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے کچھ اخذ کر لیا کریں۔ یہ سن کر حضور کے چہرے کا رنگ کچھ متغیر ہو گیا۔ مزاج شناس رسولؐ نے فوراً حضور کی ناراضگی کو پا لیا اور پکار اٹھے۔

رضیت باللہ ربًّا وبالاسلام دینًا وبمحمد نبیًّا

میں اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنا

بنی ہونے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔

مندرجۂ بالا آیات اور احادیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور پر اعتماد و ایقان کی نوعیت وہ نہیں جو عام طور پر ان الفاظ سے سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا اعتماد ہے جس میں نہ کبھی تزلزل پیدا ہو سکتا ہے، نہ کبھی شک اور نفاق جنم لے سکتے ہیں اور نہ کبھی تردد اور تذبذب وہاں اپنی راہ پاتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور پر جس طرح مکمل یقین اور اعتماد تھا اُس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہے ہم یہاں صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ ایک دفعہ کفار قریش حضور کے سب سے بڑے فدائی حضرت ابوبکرؓ کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے۔ "کیا اب بھی تم اپنے دوست کے عشق میں مبتلا ہو گے۔ تمہارا دوست اب یہ کہنے لگا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی تاریکیوں میں بیت المقدس لے گیا تھا۔ یہ بات جب حضرت ابوبکرؓ نے سنی تو فرمایا: اگر انہوں نے یہ بات فرمائی ہے تو اس کے سچ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ جو لوگ حیران تھے کہ جو چیز ان کی نگاہ میں ماورائے تصدیق ہے وہ ابوبکر کے لیے ادنیٰ موجبِ شک و ریب بھی ثابت نہیں ہوئی وہ حضرت ابوبکرؓ سے کہنے لگے "کیا یہ بات تمہاری عقل صحیح تسلیم کرتی ہے کہ وہ رات ہی رات بیت المقدس گیا اور صبح ہونے سے پہلے واپس آ گیا"

حضرت صدیق نے بڑے وثوق سے فرمایا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس بات فرمائیں اور کہیں کہ میں نے آسمانوں کو صبح و شام میں طے کر لیا تو جب بھی میں آپ کو صادق ہی مانوں گا اور میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہ ہو گی۔ اس کے بعد وہ حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ان لوگوں سے بیان فرمایا کہ آج رات آپ بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔ فرمایا ہاں۔ عرض کی اے اللہ کے نبی اس کے اوصاف مجھ سے بیان فرمائیے کیونکہ میں وہاں جا چکا ہوں۔

حضور سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا:

فَرُفِعَ لِی حَتّٰی نَظَرتُ اِلَیہِ " وہ میرے سامنے اس طرح پیش کر دیا گیا کہ میں اُسے دیکھنے لگا۔

حضورؐ جو کچھ اپنی زبان مبارک سے کہتے حضرت ابوبکر صدیقؓ صمیم قلب سے اس کو سنتے چلے جاتے اور کہتے جاتے "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسول ہیں" یہاں تک کہ جب بیان ختم ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ سے فرمایا:

"أَنْتَ يَا أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقُ" اے ابوبکرؓ تم صدیق ہو۔

رسالت پر اعتماد کی یہ وہ روشن مثال ہے جو ہر مسلمان کو اپنے پیش نظر رکھنی چاہیے۔

اس اعتماد کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت کا ایک اور ضروری جزو حضور سرورِ کائنات سے ایک مسلمان کی بے پناہ محبت بھی ہے۔ ایک مومن جب تک اپنے ایمان میں محبت کا رنگ نہیں بھرتا، اس وقت تک اُس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ پھر محبت بھی محض ظاہری اور رسمی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب ہو، جس کے مقابلے میں دنیا کے سارے تعلقات، دنیا کے سارے رشتے، اور علائق بالکل ہیچ ہوں۔ مسلمان اگر جیئے تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں جیئے اور اگر مرے تو صرف انہی کی محبت کو سینے میں لیے ہوئے اپنے اللہ کے حضور میں پیش ہو۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار بتایا گیا ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔

(التوبہ)

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ ساری چیزیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کرے۔

اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین ۔ (مشکوٰۃ ۔ باب الایمان)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔
لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من اھلہ ومالہ ۔	کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اُسے اس کے اہل ومال سے زیادہ محبوب نہیں ہوتا۔
عن عبداللہ بن ھشام قال کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو اخذ بید عمر بن الخطاب فقال لہ عمر یا رسول اللہ لانت یا رسول اللہ احب الی من کل شیئ الا من نفسی فقال لا والذی نفسی بیدہ حتی اکون الیک من نفسک فقال عمر فانک الان واللہ احب الی من نفسی فقال الاٰن یا عمرؓ (رواہ البخاری فی ایمان والنذور)	عبداللہ بن ہشام فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ حضرت عمرؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک تم کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ نہ ہوں تو تم مومن نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا اچھا اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔ آپ نے فرمایا تو اب پکے مومن بھی ہو گئے

آپ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ رسول کی محبت میں یکسر فنا ہو چکے تھے۔ یہاں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کر سکیں۔ اس لیے ہم صرف چند واقعات بیان کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے آپ کو صحابہ کی فریفتگی کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت جابرؓ کے والد جب غزوۂ احد کی شرکت کے لیے روانہ ہونے لگے تو بیٹے سے کہا کہ میں

ضرور شہید ہوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مجھ کو زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے، تم میرا قرض ادا کرنا، اور اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک کرنا۔

حضرت اسید بن حضیر ایک شگفتہ مزاج صحابی تھے، ایک روز ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے کہ آپؐ نے ان کے پہلو میں ایک چھڑی سے کونچ دیا۔ انہوں نے اس کا انتقام لینا چاہا، آپ اس پر راضی ہو گئے، لیکن انہوں نے کہا کہ آپؐ کے بدن پر قمیص ہے حالانکہ میں برہنہ تھا" آپ نے قمیص بھی اٹھا دی قمیص کا اٹھانا تھا کہ وہ آپ سے لپٹ گئے۔ پہلو چومے اور کہا یا رسول اللہ یہی مقصود تھا"

حضورؐ عموماً فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، صحابہ کرام کے سامنے آپ کی زندگی کا جب یہ منظر آجاتا تو فرطِ محبت سے آبدیدہ ہو جاتے، ایک بار حضرت عمرؓ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے، تو دیکھا کہ آپ چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں جس پر کوئی بستر نہیں، جسم مبارک پر نہبند کے سوا کچھ نہیں، پہلو میں بدھیاں پڑ گئی ہیں۔ توشہ خانہ میں صرف مٹھی بھر جو موجود تھے، آنکھوں سے بےساختہ آنسو نکل آئے، ارشاد ہوا کہ عمر کیوں روتے ہو۔ عرض کی کیوں نہ روؤں، آپ کی یہ حالت ہے اور قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے اڑا رہے ہیں، فرمایا کیا تمہیں پسند نہیں کہ ہمارے لیے آخرت اور اُن کے لیے دنیا ہو؟"

آپؐ کے وصال کے بعد صحابہ کو جب کبھی آپ کی یہ حالت یاد آتی اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلتے۔ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے دوستوں کو گوشت روٹی کھلایا تو رو پڑے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال بھی ہو گیا اور آپ نے پیٹ بھر کر جو کی روٹی کبھی نہیں کھائی۔

حضرت عبداللہ بن عمر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ فرماتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ایک دن حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا "جمعرات کا دن اور جمعرات کا دن کس قدر سخت تھا" اس کے بعد اس قدر روئے کہ زمین کی کنکریاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے پوچھا جمعرات کا دن کیا؟ بولے، اسی دن آپ کے مرض الموت میں اشتداد ہوا تھا[1]۔

---

[1] یہ سب واقعات اسوۂ صحابہ (از عبدالسلام ندوی) سے لیے گئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سلسلہ میں پھر ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ صرف ہمارے جذبات احساسات تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اسے ہماری زندگی کے سارے پہلوؤں پر محیط ہونا چاہیے۔ ہماری حیات کا کوئی گوشہ، ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اس کی فرمانروائی سے آزاد نہ ہو۔ اس محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے افکار و نظریات، ہمارے اعمال و افعال، ہماری سیرت و کردار سب میں نہ صرف اس کے اثرات نمایاں ہوں بلکہ ان سب پر حضور کی محبت کی گہری چھاپ ہو۔ وہ سب تعلیمات رسول کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اسلام میں وہ محبت بالکل بے معنی ہے جس کے پیچھے کامل اطاعت، اور مکمل اتباع کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد - ۳۳)	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائگاں نہ کرو۔
وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر رکوع ۱)	جو تم کو رسول نے دیا اس کو پکڑو اور جس سے تم کو روکا اس سے باز رہو۔
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ (آل عمران - ۴)	کہہ دو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ	تم لوگوں کے لیے یعنی اس شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو اپنی زبان فیض ترجمان میں یوں بیان فرمایا ہے:-

مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ۔ (ترمذی)	جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابی ، قیل ومن یابی یارسول اللہ ، قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابی ۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے مگر وہ جنت سے محروم رہیں گے جنہوں نے انکار کیا۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ انکار کون کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں جو انس بن مالکؓ سے مروی ہے فرمایا گیا:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بُنَیَّ ان قدرتَ اَنْ تصبحَ وتمسی ولیس فی قلبک غشٌ لاحد فافعل ثم قال یا بُنَیَّ وذالک مِن سُنَّتی من احبَّ سُنَّتی فقد اَحبَّنی ومن احبَّنی کان معی فی الجنۃ (رواہ الترمذی)

حضورؐ نے فرمایا اے فرزند اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ صبح و شام کسی وقت بھی تمہارے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہ رہے تو کر گزرو۔ کیونکہ صاف سینہ رہنا یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ کو پسند کرتا ہے وہ ضرور میری محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

صحابہ کرام اتباعِ سنّت کے اس قدر شدّت سے پابند تھے کہ اس کی نظیر انسانوں کے کسی دوسرے گروہ میں نہیں ملتی۔ حضورؐ جو عمل کرتے یا جو کچھ ارشاد فرماتے صحابہ ہمیشہ اُس کی پیروی کرتے۔ سیرت کی کتابوں میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

ایک بار آپ مسجد سے نکل رہے تھے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت مل جل کر چل رہے ہیں، عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "پیچھے رہو، تم وسطِ راہ سے نہیں گزر سکتیں" اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ عورتیں اس قدر گلی کے کنارے چلتی تھیں کہ ان کے کپڑے دیواروں سے اُلجھ جاتے تھے۔

حضرت محمد بن اسلمؓ نہایت کبیر السن صحابی تھے، لیکن جب بازار سے پلٹ کر گھر آتے اور چادر

آمارنے کے بعد یاد آتا کہ انہوں نے مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی تو کہتے کہ خدا کی قسم میں نے مسجد رسول اللہ میں نماز نہیں پڑھی حالانکہ آپ نے ہم سے فرمایا تھا کہ جو شخص مدینہ میں آئے تو جب تک اس مسجد میں دو رکعت نماز نہ پڑھ لے گھر کو واپس نہ جائے۔ یہ کہہ کر چادر اٹھاتے اور مسجد نبوی میں دو رکعت نماز پڑھ کے واپس آتے۔

حضرت حذیفہؓ کے سامنے مداین کے ایک رئیس نے چاندی کے برتن میں پانی پیش کیا، انہوں نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا کہ میں نے اس کو منع کیا تھا یہ باز نہیں آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مخالفت فرمائی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نہ صرف احکام رسول کی اتنی سختی سے اطاعت کرتے بلکہ سنن عادیہ و اتفاقیہ کا اتباع بھی بڑے ہی اہتمام سے کیا جاتا۔ حضرت ابو الدرداء جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے۔ امّ الدرداء نے کہا "اس عادت کو ترک کر دیجیے ورنہ لوگ آپ کو احمق بنائیں گے۔" بولے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جب کوئی بات کہتے تھے، مسکرا دیتے تھے۔

ایک صحابی آپ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے، دیکھا کہ آپ کی قمیص کا تکمہ کھلا ہوا ہے۔ آپ کی تقلید میں انہوں نے بھی عمر بھر قمیص کا تکمہ کھلا رکھا اور اس میں سردی اور گرمی کی کچھ پروا نہ کی۔[1]

ان سب واقعات کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ محبت جب دل میں جاگزیں ہوتی ہے تو عملی زندگی پر اس کے اثرات لازماً مرتب ہوتے ہیں۔ وہ محبت جس کی تائید عمل سے نہ ہوتی ہو وہ کوئی زیادہ قابلِ اعتماد محبت نہیں۔ اگر محبت کا جذبہ اپنی حرارت سے محبت کرنے والوں کے افکار و اعمال کو ڈھال کر انہیں محبوب کے فکر و عمل کے مطابق بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خامی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں:

ومن تامل معانی السیر والاخبار	جو شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں
الثابتۃ من شہادۃ کثیر من اھل	بہت سے اہلِ کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے
الکتاب والمشرکین لہ صلی اللہ علیہ وسلم	واقعات پڑھے گا تو اس پر یہ بخوبی روشن ہو جائیگا

[1] اسوۂ صحابہ از عبد السلام ندوی

بالرسالة وانه صادق فلم تدخلهم هٰذه الشهادة فی الاسلام علم ان الاسلام امر وراء ذالك وانه ليس هو المعرفة فقط ولا المعرفة والاقرار فقط بل المعرفة و الاقرار لانقياد والتزام طاعته و دينه ظاهراً وباطناً۔

کہ اسلام صرف آپ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں نہ وہ صرف معرفت ہے نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک ان کے علاوہ آپ کی ظاہری اور باطنی فرمانبرداری اور آپ کی پوری پوری اطاعت کا عہد بھی نہ کرے اس وقت تک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے انحطاط کا سب سے بڑا سبب سنّت نبویؐ کے ترک کو قرار دیتے ہیں وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تحریف کے سب راستوں سے متنبہ فرمایا اور اس بارے میں امت سے عہد و پیمان لیے۔ امت میں کاہلی اور سستی کا سب سے بڑا سبب سنت سے صرف نظر ہے اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: مجھ سے پہلے خداوند تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جسے اپنی امت میں سے ایسے حواری اور اصحاب نہ ملے ہوں جو اس کی سنّت پر عمل کرتے اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ پھر اُن کے بعد نااہل لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں اور جن باتوں کا حکم انہیں نہیں ہوتا وہ کرتے ہیں، پس جو ان سے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے جو ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان سے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جس میں نے دیا ہو یا جس سے منع کیا ہو۔ تو وہ کہنے لگے میں کچھ نہیں جانتا جو کچھ ہم نے کتاب اللہ میں پایا اس کا ہم نے اتباع کیا۔" (یاد رکھو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنّت پر عمل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔"

پچھلے صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضورؐ کے ساتھ ہمارا رشتہ کس قدر گہرا اور پائیدار ہے اور یہ دوسرے تمام رشتوں پر کس قدر حاوی ہے۔ سخت نادان ہیں وہ لوگ جو حضورؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کو صرف کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلق سے تعبیر کرتے ہیں یا حضورؐ کو کسی متعمد ہرکارے یا دیانتدار چٹھی رساں کی حیثیت دیتے ہیں۔ حضورؐ کا کام صرف ابلاغِ حق ہی نہیں تھا بلکہ اس کا انفاذ اور قیام بھی تھا۔ حضورؐ کی ذاتِ مقدس اس دین کی عملی تشریح ہے۔ حضورؐ ایک قاصد سے کہیں زیادہ بڑھ کر ایک معلّم، ایک مزکّی، ایک مرشد، ایک مبیّن، ایک مبشّر ایک منذر اور ایک سراجِ منیر ہیں۔ کلامِ الٰہی جس پیکرِ محسوس میں اپنی مکمل ترین صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ حضور سرورِ دو عالم کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔

پھر حضورؐ کی یہ مختلف حیثیتیں صرف آپ کے زمانے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ قیامت تک اسی طرح رہیں گی جب تک یہ زمین وہ آسمان قائم ہیں اس وقت تک انسانیت کی سعادت انہی کی بلاچون وچرا اطاعت سے وابستہ ہے جس چیز کو آپ نے حق کہہ دیا وہ وقت کے ہزار اختلاف کے باوجود ہمیشہ حق ہی رہے گی اور جسے آپ نے باطل قرار دیا اُسے گردشِ ایام کبھی بھی حق میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ ایک مسلمان اپنے مسائل کو دورِ آفاق کے بدلتے ہوئے سچائی معیاروں سے حل نہیں کرتا بلکہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کو صرف حضورؐ کے اشارۂ ابرو سے طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضورؐ کی نبوت کوئی ایسی نہیں ہیں جس کی راہ میں زمانہ کی دیواریں حائل ہوں۔ حضورؐ کی رسالت ابدی اور آفاقی ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالکل ماورا۔ جنابِ رسالتمآب آج بھی ایک مسلمان کے لیے ہادی اور مطاع ہیں جس طرح اپنی زندگی میں تھے۔ ایک انسان خواہ کسی دور اور کسی ملک کا رہنے والا ہو اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ حضورؐ کی چاکری اختیار نہ کرے اور پھر اس پر کسی قسم کا انقباض اور تنگی محسوس کرنے کی بجائے اسے اپنے لیے دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ موجبِ افتخار و اعزاز نہ سمجھے۔

حضورؐ کی محبت ہی ایک مسلمان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ایسا سرمایہ جس کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایمان ایسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ حدیث میں اسی امر کی وضاحت میں کہا گیا ہے:۔

(باقی ص ۶۴ پر)

تفہیم القرآن

الشُّعراء

نام | آخری رکوع کی آیت وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | مضمون اور اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورے کا زمانۂ نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر واقعہ اور اس کے بعد الشعراء (روح المعانی جلد ۱۹ صفحہ ۶۴)۔ اور سورۂ طٰہٰ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

موضوع اور مباحث | تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تذکیر کا مقابلہ پیہم جحود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشتے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر ہمیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو۔ کبھی آپ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اڑا دینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپ کے مشن کا استخفاف کرتے کہ ان کے پیرو یا تو چند نادان نوجوان ہیں، یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات کے لوگ، حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشرافِ قوم اور شیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و معاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، مگر وہ ہٹ دھرمی کی نت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی چیز آنحضورؐ کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی اور اس غم میں آپ کی جان گھلی جاتی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے

اپنی جان کیوں گھلاتے ہو۔ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے، کسی ایسی نشانی کے طالب ہیں جو زبردستی ان کی گردنیں جھکا دے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آجائے گی تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انہیں سمجھائی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد دسویں رکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ طالب حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے ہیں، نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اُس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفارِ مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جنہیں دیکھ کر ہر صاحبِ عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قومِ نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قومِ لوط اور اصحاب الایکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی حجتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے۔ اور آخر کار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاء کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حجت

کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں اور کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسری بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رکوع میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں؟ اس قرآن کو دیکھو جو تمہاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جن کا کلام ہو سکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا تمہیں کاہن نظر آتا ہے؟ کیا محمدؐ اور ان کے اصحاب تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مشرب ہوا کرتے ہیں؟ ضد م ضدا کی بات دوسری ہے، مگر اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجام دیکھ کر رہو گے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

طٰسٓمٓ۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں[1]

---

[1] یعنی یہ آیات، جو اس سورے میں پیش کی جا رہی ہیں، اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف کھول کر بیان کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر یا سُن کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی طرف بلاتی ہے، کس چیز سے روکتی ہے، کسے حق کہتی ہے اور کسے باطل قرار دیتی ہے۔ ماننا یا نہ ماننا الگ بات ہے، مگر کوئی شخص یہ بہانہ کبھی نہیں بنا سکتا کہ اس کتاب کی تعلیم اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ اس سے یہ معلوم ہی نہ کر سکا کہ وہ

اَے محمدؐ، شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے[ے] ہم چاہیں تو

اُس کو کیا چیز چھوڑنے اور کیا اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

قرآن کو الکتاب المبین کہنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا کتاب الٰہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے مضامین، اس کے پیش کردہ حقائق، اور اس کے حالاتِ نزول، سب کے سب صاف صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ خداوند عالم ہی کی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ہر فقرہ جو اس کتاب میں آیا ہے ایک نشانی اور ایک معجزہ (آیت) ہے۔ کوئی شخص عقل و خرد سے کام لے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کرنے کے لیے کسی اور نشانی کی حاجت نہیں، کتابِ مبین کی یہی آیات (نشانیاں) اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ مختصر تمہیدی فقرہ اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے اُس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو آگے اس سورہ میں بیان ہوا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگتے تھے تاکہ اس نشانی کو دیکھ کر انہیں اطمینان ہو کہ واقعی آپ یہ پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر حقیقت میں کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتابِ مبین کی یہ آیات موجود ہیں۔ اسی طرح کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ آپ شاعر یا کاہن ہیں۔ فرمایا گیا کہ یہ کتاب کوئی چیستان اور معما تو نہیں ہے۔ صاف صاف کھول کر اپنی تعلیم پیش کر رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسی شاعر یا کاہن کی ہو سکتی ہے؟

ے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں فرمایا فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا "شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے" (رکوع ۱) اور سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ "ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمہاری جان نہ گھلے" (رکوع ۲)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اپنی قوم کی گمراہی و ضلالت، اس کی اخلاقی پستی، اس کی ہٹ دھرمی اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کا رنگ دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم برسوں اپنے شب و روز کس دل گداز و جاں گسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔

آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں[۳] ۔ ان لوگوں

بخع کے اصل معنی پوری طرح ذبح کر ڈالنے کے ہیں۔ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے لغوی معنی یہ ہوئے کہ تم اپنے آپ کو قتل کیے دے رہے ہو۔

[۳] یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان وطاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و خرد سے کام لے کر اُن آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتابِ الٰہی میں پیش کی گئی ہیں، جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترکِ باطل اور اتباعِ حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط، جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جا سکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رجحانات رکھ دیے ہیں، فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے، نبوت اور وحی اور دعوتِ خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسبِ حال صلاحیتیں دے کر اس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان وطاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمالے جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرمانبردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا وَلَوْ شَآءَ

کے پاس رحمان کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں، عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں۔

رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ " اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟" (یونس۔ رکوع ۱۰)۔ اور وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ "اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا۔ وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا" (ہود۔ رکوع ۱۰)۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحات ۳۱۳ و ۳۷۳۔

یعنی جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقول طریقوں سے ان کو سمجھانے اور راہِ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے اس کا مقابلہ بے رخی و بے التفاتی سے کریں ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انہیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف جب وہ بے رخی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکذیب پر، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجام بد انہیں دکھا دیا جائے۔ یہ انجام بد اس شکل میں بھی انہیں دکھایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاحمتوں کے باوجود غالب آجائے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان پر ایک عذابِ الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اس شکل میں بھی ان کے سامنے آسکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخر کار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انہوں نے اپنا تمام سرمایۂ زندگانی کھپا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اڑاتے رہے۔ اس انجام بد کے سامنے آنے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اور

اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں ؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے۵ مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۶ ع رکوع

مختلف لوگوں کے سامنے وہ مختلف صورتوں سے آسکتا ہے اور آ رہا ہے، اسی لیے آیت میں نَبَأ کے بجائے اَنْبَاء بصیغۂ جمع فرمایا گیا، یعنی جس چیز کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں اس کی حقیقت آخر کار بہت سی مختلف شکلوں میں انہیں معلوم ہو گی۔

۵۔ یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظام کائنات کی جو حقیقت (توحید الٰہ) انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے، یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادوں اور قوتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اُگ رہی ہیں، پھر اُن کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے، یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو ؟

انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جبکہ تمہارے رب نے موسیٰؑ کو پکارا "ظالم قوم

۱۰ یعنی اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزا دینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے، مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیے جاتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

۱۱ اوپر کی مختصر تمہیدی تقریر کے بعد اب تاریخی بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کی ابتدا حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے سے کی گئی ہے۔ اس سے خاص طور پر جو سبق دینا مقصود ہے وہ یہ کہ:

اولاً، حضرت موسیٰ کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا وہ ان حالات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ سخت تھے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ درپیش تھا۔ حضرتِ موسیٰ ایک غلام قوم کے فرد تھے جو فرعون اور اس کی قوم سے بُری طرح دبی ہوئی تھی، بخلاف اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک فرد تھے اور آپ کا خاندان قریش کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بالکل برابر کی پوزیشن رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے خود اس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی اور ایک قتل کے الزام میں دس برس روپوش رہنے کے بعد انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اسی بادشاہ کے دربار میں جا کھڑے ہوں جس کے ہاں سے وہ جان بچا کر فرار ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کسی نازک صورتِ حال سے سابقہ نہ تھا۔ پھر فرعون کی سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ور سلطنت تھی۔ قریش کی طاقت کو اس کی طاقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرعون حضرت موسیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخر کار ان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ جس کی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہو اس کا مقابلہ کر کے کوئی جیت نہیں سکتا۔ جب فرعون کی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کچھ پیش نہ گئی تو تم بیچارے کیا ہستی ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بازی جیت لے جاؤ گے۔

ثانیاً، جو نشانیاں حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے فرعون کو دکھائی گئیں اس سے زیادہ کھلی نشانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں فرعون ہی نے چیلنج پر علی الاعلان

کے پاس جا — فرعون کی قوم پاس ۶ — کیا وہ نہیں ڈرتے ۷؟" اُس نے عرض کیا

جادوگروں سے مقابلہ کر کے یہ ثابت بھی کر دیا گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ دکھا رہے ہیں وہ جادو نہیں ہے۔ فنِ سحر کے جو ماہرین فرعون کی اپنی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور اُس کے اپنے بلائے ہوئے تھے، انہوں نے خود یہ تصدیق کر دی کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا اژدہا بن جانا ایک حقیقی تغیّر ہے اور یہ صرف خدائی معجزے سے ہو سکتا ہے، جادوگری کے ذریعہ سے ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ ساحروں نے ایمان لا کر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ چھوڑی کہ حضرت موسیٰ کی پیش کردہ نشانی واقعی معجزہ ہے، جادوگری نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی جو لوگ ہٹ دھرمی میں مبتلا تھے انہوں نے نبی کی صداقت تسلیم کر کے نہ دی۔ اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارا ایمان لانا درحقیقت کوئی حسّی معجزہ اور مادّی نشان دیکھنے پر موقوف ہے۔ تعصب، حمیّتِ جاہلیہ، اور مفاد پرستی سے آدمی پاک ہو اور کھلے دل سے حق اور باطل کا فرق سمجھ کر غلط بات کو چھوڑنے اور صحیح بات قبول کرنے کے لیے کوئی شخص تیار ہو تو اس کے لیے وہی نشانیاں کافی ہیں جو اس کتاب میں اور اس کے لانے والے کی زندگی میں اور خدا کی وسیع کائنات میں ہر آنکھوں والا ہر وقت دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ ایک ہٹ دھرم آدمی جسے حق کی جستجو ہی نہ ہو اور اغراضِ نفسانی کی بندگی میں مبتلا ہو کر جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ کسی ایسی صداقت کو قبول نہ کرے گا جس سے اسکی اغراض پر ضرب لگتی ہو، وہ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے گا خواہ زمین اور آسمان ہی اس کے سامنے کیوں نہ اُلٹ دیئے جائیں۔

۶ تا ۶۔ اس ہٹ دھرمی کا جو انجام فرعون نے دیکھا وہ کوئی ایسا انجام تو نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ بے تاب ہوں۔ اپنی آنکھوں سے خدائی طاقت کے نشانات دیکھ لینے کے بعد جو نہیں مانتے وہ پھر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کیا تم لوگ اس سے عبرت

"اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں[۱۱]۔ اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جُرم کا الزام بھی ہے"

حاصل کرنے کے بجائے اس کا مزا چکھنا ہی پسند کرتے ہو؟

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳ تا ۴۷-۱۰۲ تا ۱۰-۳۱-۴۶ تا ۹۴۶ جلد سوم ص ۸۵ تا ۱۰۱

۸؎ یہ انداز بیان قومِ فرعون کے انتہائی ظلم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعارف ہی "ظالم قوم" کے لقب سے کرایا گیا ہے۔ گویا اس کا اصل نام ظالم قوم ہے اور قومِ فرعون اس کا ترجمہ و تفسیر۔

۹؎ یعنی اے موسیٰ، دیکھو کیسی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مختارِ مطلق سمجھتے ہوئے دنیا میں ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور اس بات سے بے خوف ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان سے باز پرس کرنے والا ہے۔

۱۰؎ سورہ طٰہٰ رکوع ۲، اور سورہ قصص رکوع ۴ میں اس کی جو تفصیل آئی ہے اسے ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اوّل تو اتنے بڑے مشن پر تنہا جاتے ہوئے گھبراتے تھے (میرا سینہ گھٹتا ہے کے الفاظ اسی کی نشان دہی کرتے ہیں) دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت ہارون کو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے نبی بنا کر بھیجا جائے کیونکہ وہ زیادہ زبان آور ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو وہ ان کی تائید و تصدیق کر کے ان کی پشت مضبوط کریں گے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً حضرت موسیٰ کی درخواست یہی رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارون کو اس منصب پر مامور کیا جائے، اور بعد میں جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ مرضی الٰہی آپ ہی کو مامور کرنے کی ہے تو پھر یہ درخواست کی ہو کہ انہیں آپ کا وزیر اور مددگار بنایا جائے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ ان کو وزیر بنانے کی درخواست نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ "آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں" اور سورہ طٰہٰ میں وہ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي "میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر مقرر فرما دیجیے، میرے بھائی ہارون کو"۔ نیز سورہ قصص میں وہ یہ عرض کرتے ہیں کہ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ "میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہیں لہٰذا آپ انہیں مددگار

اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔[۱۱] فرمایا "ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر،[۱۲] ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، ہم کو رب العٰلمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے[۱۳]۔"

کے طور پر میرے ساتھ بھیجیے تاکہ وہ میری تصدیق کریں۔" اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ مؤخر الذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں، اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰ سے اس سورے میں نقل ہوئی ہے۔

بائیبل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کی تکذیب کا خوف اور اپنی زبان کے کند ہونے کا عذر پیش کر کے یہ منصب قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا: "اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج" پھر اللہ تعالیٰ نے بطور خود حضرت ہارون کو ان کے لیے مددگار مقرر فرما کر انہیں اس بات پر راضی کیا کہ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس جائیں (خروج باب ۴۔ آیات ۱ تا ۱۷)

[۱۱] یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو سورۂ قصص رکوع ۲ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ کو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی اطلاع قوم فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں تو وہ ملک چھوڑ کر مدین کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشی کے بعد یکایک انہیں یہ حکم دیا گیا کہ تم پیغام رسالت لیکر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ پہلے سے موجود ہے تو حضرت موسیٰ کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سنانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا۔

[۱۲] نشانیوں سے مراد عصا اور ید بیضا کے معجزے ہیں جن کے عطا کیے جانے کی تفصیل سورۂ طٰہٰ رکوع ۱، سورۂ نمل رکوع ۱، اور سورۂ قصص رکوع ۴ میں بیان ہوئی ہے۔

[۱۳] حضرت موسیٰ و ہارون کی دعوت کے دو جز تھے۔ ایک، فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، جو تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود رہا ہے۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو فرعون کے بندِ غلامی سے نکالنا، جو مخصوص طور پر انہی دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآن مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جزء کا ذکر کیا گیا ہے (مثلاً سورۂ نازعات میں) اور کسی جگہ صرف دوسرے جز کا۔

فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟[۱۴] تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے، اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا،[۱۵] تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔"

موسیٰ نے جواب دیا "اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔[۱۶] پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا[۱۷] اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔"[۱۸]

[۱۴] اس سے ایک اشارہ اس خیال کی تائید میں نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون نہ تھا جس کے گھر میں حضرت موسیٰ نے پرورش پائی تھی، بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔ اگر یہ وہی فرعون ہوتا تو کہتا کہ میں نے تجھے پالا تھا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہاں تو رہا ہے اور ہم نے تیری پرورش کی ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۴ و ۷۱)۔

[۱۵] اشارہ ہے اسی واقعۂ قتل کی طرف جو حضرت موسیٰ سے سرزد ہو گیا تھا۔

[۱۶] اصل الفاظ ہیں وانا من الضالین "میں اس وقت ضلالت میں تھا" یا "میں نے اس وقت یہ کام ضلالت کی حالت میں کیا تھا"۔ یہ لفظ ضلالت لازماً "گمراہی" کا ہی ہم معنی نہیں ہے، بلکہ عربی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطا، نسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے سے یہاں ضلالت بمعنی خطا یا نادانستگی ہی لینا زیادہ صحیح ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس قبطی کو ایک اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھ کر صرف ایک گھونسا مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ گھونسے سے بالعموم آدمی مرتا نہیں ہے، نہ قتل کی نیت سے گھونسا مارا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے وہ شخص مر گیا۔ اس لیے صحیح صورتِ واقعہ یہی ہے کہ یہ قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطا تھا۔ قتل ہوا ضرور، مگر بالارادہ قتل کی نیت سے نہیں ہوا، نہ کوئی ایسا آلہ یا ذریعہ استعمال کیا گیا جو قتل کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے یا جس سے قتل واقع ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

[۱۷] یعنی علم و دانش اور پروانۂ نبوت۔ حکم کے معنی حکمت و دانش کے بھی ہیں، اور اس سندِ اقتدار (authority) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو عطا کی جاتی ہے جس کی بنا پر وہ اختیار کے ساتھ بولتا ہے۔

[۱۸] یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا۔ تیرے ہی

فرعون نے کہا[۱۹] "اور یہ رب العلمین کیا ہوتا ہے[۲۰]؟"

موسیٰ نے جواب دیا "آسمانوں اور زمین کا رب، اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو[۲۱]۔"

فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا "سنتے ہو؟"

موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے اُن آباواجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں[۲۲]۔"

ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا۔ اس لیے اس پرورش کا احسان جتانا تجھے زیب نہیں دیتا۔

۱۹ے بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو رب العلمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کر کے فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ یہ بات آپ سے آپ ظاہر ہے کہ نبی نے ضرور وہ پیغام پہنچا دیا ہو گا جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اسے چھوڑ کر اب وہ گفتگو نقل کی جاتی ہے جو اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون اور موسیٰ کے درمیان ہوئی۔

۲۰ے یہ اُس کا سوال حضرت موسیٰ کے اس قول پر تھا کہ میں رب العلمین (تمام جہان والوں کے مالک و آقا اور فرمانروا) کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس پیغام کی نوعیت صریح طور پر سیاسی تھی۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ حضرت موسیٰ جس کی نمائندگی کے مدعی ہیں وہ سارے جہان والوں پر حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون کو اپنا تابع قرار دے کر اس کے دائرہ حکومت و اقتدار میں ایک بالاتر فرمانروا کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مداخلت کر رہا ہے بلکہ اس کے نام یہ فرمان بھیج رہا ہے کہ تو اپنی رعایا کے ایک حصّے کو میرے نامزد کردہ نمائندے کے حوالے کر دے تاکہ وہ اسے تیری سلطنت سے باہر نکال لے جائے۔ اس پر فرعون پوچھتا ہے کہ یہ سارے جہان والوں کا مالک و فرمانروا ہے کون جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کے ہاتھوں یہ حکم بھیج رہا ہے؟

۲۱ے یعنی میں زمین پر بسنے والے کسی مخلوق اور فانی مدعیِ ملوکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک و فرمانروا ہے

فرعون نے (حاضرین سے) کہا "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں"۔

موسیٰ نے کہا "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"۔[۲۲][۲۳]

فرعون نے کہا "اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں"۔[۲۴]

تو تمہیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہونی چاہیے کہ سارے جہان والوں کا رب کون ہے۔

۲۲؎ یعنی میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے، اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں۔ تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں۔ میں صرف اُس رب کی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ دادا گذر چکے ہیں ان سب کا رب بھی تھا۔

۲۳؎ یعنی مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارا فرعون ہے، جو زمین کے ایک ذرا سے رقبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مصر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو فرمانروائی اسی کی مانتا ہوں اور اسی کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

۲۴؎ اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی "معبود" کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا یعنی یہ کہ اُسے بس پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے استمداد و استعانت کے لیے دعائیں مانگیں لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملاتِ دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کو قانونِ برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختار مطلق ہیں، کسی معبود کو ہماری سیاست اور ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہیوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ انہوں نے ان سے خداوندِ عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور

موسیٰ نے کہا "اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟"[۲۵]
فرعون نے کہا "اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے۔"[۲۶]

یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیتِ مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھیرایا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے۔ اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ موسیٰ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر صرف اسی معنی میں توحیدِ فی العبادت کی دعوت حضرت موسیٰ نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضبناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دینِ آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰؑ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پنڈتوں سے مناظرہ کر لو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ نے رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اُسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکمِ برتر کا پیغامبر آکر اس سے اطاعتِ امر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری ماننے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکمِ برتر مانے۔ اسی لیے اس نے پہلے "رب العالمین" کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبودیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا، پھر جب حضرت موسیٰ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العٰلمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف صاف دھمکی دے دی کہ ملکِ مصر میں تم نے میرے اقتدارِ اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام بھی لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

۲۵ے یعنی کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جبکہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العٰلمین و رب السموات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے؟

۲۶ے حضرت موسیٰ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا۔ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کے الٰہ الالٰہہ ہونے کو مانتا تھا اور دوسرے مشرکین کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اُس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اسی کا بھیجا ہوا ہوں

(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدہا تھا[۲۷]

پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا[۲۸] ع

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا "یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے[۲۹]۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو[۳۰]؟"

اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالکِ کائنات ہونے ہی میں کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ نشانی کی بات تو اسی صورت میں درمیان آسکتی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا فرمانروائے مطلق ہونا تو مسلّم ہو، اور بحث اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰ اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

۲۷ے قرآن مجید میں کسی جگہ اس کے لیے حَیَّةٌ (سانپ) اور کسی جگہ جَانٌّ (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اُسے ثُعْبَانٌ (اژدہا) کہا جا رہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازی اس طرح کرتے ہیں کہ حَیَّةٌ عربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور ثُعْبَانٌ کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ جسامت کے اعتبار سے وہ اژدہے کی طرح تھا۔ اور جَانٌّ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ اس کی پھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔

۲۸ے بعض مفسرین نے یہودی روایات سے متاثر ہو کر بیضاء کے معنی "سفید" کیے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بغل سے نکالتے ہی بھلا چنگا ہاتھ برص کے مریض کی طرح سفید ہو گیا۔ لیکن ابن جریر، ابن کثیر، زمخشری، رازی، ابو السعود عمادی، آلوسی اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں بیضاء بمعنی روشن اور چمکدار ہے۔ جونہی کہ حضرت موسیٰ نے بغل سے ہاتھ نکالا یکایک سارا ماحول جگمگا اٹھا اور یوں محسوس ہوا جیسے سورج نکل آیا ہے۔

۲۹ے دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یا تو ایک لمحہ پہلے وہ اپنی رعیت کے ایک فرد کو بر سرِ دربار رسالت کی باتیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتے دیکھ کر پاگل قرار دے رہا تھا (کیونکہ اس کے نزدیک ایک غلام قوم کے فرد کا اس جیسے باجبروت بادشاہ کے حضور ایسی جسارت کرنا پاگل پن کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا) اور اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود مانا تو جیل میں سڑا سڑا کر مار دوں گا، یا اب ان نشانیوں کو دیکھتے ہی اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسے اپنی بادشاہی اور اپنا ملک چھننے کا خطرہ لاحق ہو گیا اور بدحواسی میں اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں بھرے دربار میں اپنے نوکروں کے سامنے کیسی بے تکی باتیں کر رہا ہوں۔ بنی اسرائیل جیسی دبی ہوئی قوم کے دو افراد وقت کے سب سے بڑے طاقتور بادشاہ کے

انہوں نے کہا "اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں آدمی بھیجیے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔"

چنانچہ ایک روز مقررہ وقت پر[۳۱] جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا "تم اجتماع میں چلو گے؟[۳۲]"

سامنے کھڑے تھے۔ کوئی لاؤ لشکر ان کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی جان ان کی قوم میں نہ تھی۔ کسی لیڈرشپ کا نام و نشان تک ملک کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ اس حالت میں صرف ایک لاٹھی کا اژدہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتے دیکھ کر یکایک اس کا چیخ اٹھنا کہ یہ دو بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دیں گے اور پورے حکمران طبقے کو اقتدار سے بے دخل کر دیں گے، آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہوا، کوئی ملک فتح نہیں ہوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادوگر تو اس کے اپنے ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے۔ مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کر کے انعام لینے سے بڑھ کر ان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ سلطنت تو کجا، وہ بیچارے تو سلطنت کے کسی پولیس کانسٹیبل کو بھی چیلنج کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

[۳۰] یہ فقرہ فرعون کی مزید بدحواسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کہاں تو وہ الٰہ بنا ہوا تھا اور یہ سب اس کے بندے تھے۔ کہاں اب الٰہ صاحب مارے خوف کے بندوں سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہارا حکم کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری عقل تو اب کچھ کام نہیں کرتی، تم بتاؤ کہ اس خطرے کا مقابلہ میں کیسے کروں۔

[۳۱] سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ اس مقابلے کے لیے قبطیوں کی قومی عید کا دن (یوم الزینۃ) مقرر کیا گیا تھا تاکہ ملک کے گوشے گوشے سے میلوں ٹھیلوں کی خاطر آنے والے سب لوگ یہ عظیم الشان "دنگل" دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں، اور اس کے لیے وقت بھی دن چڑھے کا طے ہوا تھا تاکہ روز روشن میں سب کی آنکھوں کے سامنے فریقین کی طاقت کا مظاہرہ ہو اور روشنی کی کمی کے باعث کوئی شک و شبہ پیدا ہونے کی گنجائش نہ رہے۔

[۳۲] یعنی صرف اعلان و اشتہار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آدمی اس غرض کے لیے چھوڑے گئے کہ لوگوں کو اکسا اکسا کر یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے لائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھرے دربار میں جو معجزات حضرت موسیٰ نے دکھائے تھے ان کی خبر عام لوگوں میں پھیل چکی تھی اور فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس سے ملک کے باشندے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور خود دیکھ لیں کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہمارے ملک کا ہر جادوگر یہ کمال دکھا سکتا ہے۔

شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔[۳۳]"

جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا "ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟"[۳۴]

اس نے کہا "ہاں، اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔"[۳۵]

۳۳؎ یہ فقرہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جن حاضرینِ دربار نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تھا، اور باہر جن لوگوں تک اس کی معتبر خبریں پہنچی تھیں ان کے عقیدے اپنے دینِ آبائی پر سے متزلزل ہوئے جا رہے تھے، اور اب ان کے دین کا دارومدار بس اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کن مقابلہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے پھر رہے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو ہم موسیٰ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے ورنہ ہمارے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے۔

۳۴؎ یہ تھے وہ حامیانِ دینِ مشرکین جو موسیٰ علیہ السلام کے حملے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے اس فیصلہ کن مقابلے کے وقت ان پاکیزہ جذبات کے ساتھ آئے تھے کہ ہم نے پالا مار لیا تو سرکار سے کچھ انعام مل جائے گا۔

۳۵؎ اور یہ تھا وہ بڑے سے بڑا اجر جو خادمانِ دین و ملت کو بادشاہِ وقت کے ہاں سے مل سکتا تھا یعنی روپیہ پیسہ ہی نہیں ملیگا، دربار میں کرسی بھی نصیب ہو جائیگی۔ اس طرح فرعون اور اس کے ساحروں نے پہلے ہی مرحلے پر نبی اور جادوگر کا عظیم اخلاقی فرق خود کھول کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ حوصلہ تھا کہ بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے ایک الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں دندانہ آکھڑا ہوتا ہے اور دھڑتے کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اللہ رب العٰلمین کا بھیجا ہوا ہوں، بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر۔ فرعون سے دو بدو بحث کرنے میں وہ ادنیٰ سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کو وہ پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ دوسری طرف یہ کم حوصلگی ہے کہ اسی فرعون کے ہاں باپ دادا کے دین کو بچانے کی خدمت پر بلائے جا رہے ہیں، پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار، کچھ انعام تو مل جائے گا نا، اور جواب میں یہ سُن کر پھولے نہیں سماتے کہ پیسہ بھی ملے گا اور قربِ شاہی سے بھی سرفراز کیے جاؤ گے۔ یہ دو متقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جادوگروں کی کیا ہستی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص بے حیائی کی ساری حدوں کو نہ پھاند جائے، وہ نبی کو جادوگر کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

بیمۂ زندگی یا لائف انشورنس

اسلامی نقطۂ نگاہ سے

جناب نیم صدیقی صاحب

کئی ماہ گزرے لاہور کی ایک ایسوسی ایشن نے جو انشورنس کمپنیوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی، نکتۂ بالا موضوع پر ایک بزم مباحثہ منعقد کرائی جس میں بعض دوسرے حضرات کے ساتھ مجھے بھی اظہار خیال کا موقع دیا گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر جو تقریر کی اسے ترجمان القرآن میں دینا چاہتا تھا، مگر متعلقہ یادداشتیں میرے کاغذات کے جنگل میں کھو گئیں۔ اب اتفاقاً یہ گم شدہ مال برآمد ہو گیا ہے۔ سو برادر محترم پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے اصرار کے تحت تقریر مرتب کر کے پہلی نیت کے مطابق ترجمان القرآن میں پیش کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ کسی افادیت کی حامل ہو۔ (ن ص)

جناب صدر! حاضرین محترم!!

بہ حیثیت ایک مسلمان کے مجھے اس امر پر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اب ہمارے معاشرے میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اس کا نظامِ کار اسلام کے مطابق ہے یا خلاف جاتا ہے۔ یہ ایمانی حس کی بیداری کا ثبوت ہے کہ ہم لوگ ہر معاملے میں کم سے کم یہ سوچنے ضرور لگے ہیں کہ فلاں ادارہ، فلاں تنظیم کار اور فلاں کاروبار اسلام کی نگاہ میں کیا نوعیت رکھتا ہے۔ مدتوں سے ہماری یہ ایمانی حس سُن ہوئی پڑی رہی ہے۔ اس حس کی بیداری بہت بڑی تعمیری تبدیلیوں کا امکان سامنے لاتی ہے۔

اس مسرت کے ساتھ ساتھ ایک پہلو تشویش کا بھی ہے۔ وہ یہ کہ ابھی تک ہمارے تعلیم یافتہ طبقوں میں دورِ غلامی کا پیدا کیا ہوا یہ ذہنی روگ باقی ہے کہ وہ مغرب کے دیئے ہوئے نظریات اور تمدنی ادارات کو مرعوبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو جوں کا توں رکھ کر اسلامی نظامِ فکر میں ان کی جگہ بنانا چاہتے ہیں

بلکہ یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ بعض حلقے اس کمزوری کے لحاظ سے اور زیادہ "خاروارڈ" ہو گئے ہیں اور بڑی بے باکی سے مغربی تمدن کے تصورات، مقاصد اور ادارات کی تائید میں خود اسلام کو لا لاکے کھڑا کرتے ہیں اور اس سے اپنے حق میں آمین کہلوانا چاہتے ہیں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جس مجلس سے خطاب کرنے کا شرف مجھے حاصل ہے، وہ سنجیدہ، تعلیم یافتہ، حقیقت پسند اور متوازن ذہن کے منتخب اصحاب پر مشتمل ہے۔ جو کچھ امید کہ میں اپنے آپ سے کرتا ہوں، ٹھیک اس کے مطابق آپ سے بھی حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ ہم سب لوگ مل جل کر انشورنس کے مروجہ نظام کو اسلامی اصولوں کے بالمقابل رکھتے ہوئے بے لاگ طریقے سے یہ دیکھیں گے کہ دونوں میں کہاں تک موافقت ہے اور کس قدر اختلاف۔ پھر جو کچھ وجوہِ اختلاف سامنے آئیں گے ان کا ازالہ کرنے کے لیے اسلام میں ترمیم کرنے کے بجائے انشورنس کے مروجہ نظامِ کار کی تشکیلِ نو پر کاوش کریں گے۔ اس صحیح رخ پر اگر ہم اپنی کاوشوں کو روبہ عمل لاسکیں تو ہماری یہ نشست بہت ہی قیمتی نتائج کی حامل ہوگی۔

بیمہ (انشورنس) کا فطری داعیہ انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ جن حوادث اور نقصانات اور آفات سے دوچار ہوتا ہے، صرف ان کے پیش آجانے پر ہی ممکن تدابیر سے ان کا مقابلہ نہیں کرتا، بلکہ ایک مرتبہ تجربہ ہو جانے کے بعد ان کی پیش بندی کی فکر بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ حادثوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ مستقبل کے اندیشوں کا سدِ باب بھی کرنا چاہتا ہے۔ ہر مصیبت جو اسے ایک بار پیش آتی ہے، گویا اسے انتباہ دے جاتی ہے کہ میں دوبارہ بھی آسکتی ہوں۔ اور اس انتباہ کو سن کر وہ لازماً اس فکر و کاوش میں پڑ جاتا ہے کہ یہی مصیبت اگر پھر آئے تو اس سے بچاؤ کے لیے پیشگی تدابیر کیا اختیار کی جاسکتی ہیں، نیز اس کی آمد کا دروازہ کیسے بند کیا جاسکتا ہے۔

حوادث، مصائب، آفات اور اندیشوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ ارضی بھی ہوتے ہیں، سماوی بھی! جانی و جسمانی بھی ہوتے ہیں، زرعی و اقتصادی بھی! ان تمام اقسام کے مصائب اور اندیشوں کا سامنا کرتے ہوئے انسانی فطرت سر ڈال کر بیٹھ رہنے کے بجائے ان کے انسداد کی تدابیر میں لگی رہتی ہے۔ ایک

ناکام ہوتی ہے تو وہ دوسری تدبیر کو آزماتی ہے۔ وہ طرح طرح کے ذرائع و وسائل ایجاد کرتی اور قسم قسم کی تنظیمیں قائم کرتی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام ایجادات، تمام ذرائع و وسائل اور تمام کے تمام تمدنی ادارات کی تشکیل اسی ضرورت سے ہوتی ہے کہ آفات و مصائب اور ان کے اندیشوں کا سدِ باب کیا جا سکے۔ انسانی فطرت کا یہ رجحان تمدنی ارتقا کے محرکات میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔ بارش سے بچاؤ کے لیے مکانوں کی تعمیر، پانی کے نکاس کے لیے پرنالوں اور نالیوں کی ساخت، سڑکوں پر حادثات سے بچاؤ کے لیے انتباہی نشانات کا نصب کرنا، چوراہوں میں ٹریفک کے سپاہی کی تعیناتی، سیلابوں کے پیشِ نظر بند باندھنا، خشک سالی سے زراعت کو بچانے کے لیے آبپاشی کے انتظامات، آتش زدگیوں کی روک تھام کے لیے فائر بریگیڈوں کا قیام، جرائم کے انسداد کے لیے پولیس کا قیام اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے لیے فوجی قوت کی بہم رسانی۔ یہ سب کچھ اپنے اپنے دائرے میں ایک طرح کا انشورنس ہے جسے ہماری فطرت مانگتی ہے۔ انسان حالتِ خوف سے نکل کر ایک احساسِ تحفظ میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ ایک گارنٹی اور ایک انشورنس کا طلب گار ہے۔ مادی زندگی کے لحاظ سے شاید حکومت و ریاست وہ سب سے بڑا ادارہ ہے جو اسے بہت سارے پہلوؤں سے احساسِ تحفظ بہم پہنچاتا ہے اور جس کے برطرف ہو جانے پر امان اٹھ جاتی ہے۔ پھر اس کے تحت بے شمار دوسرے ادارات برسرِ عمل رہتے ہیں۔ گویا انسان ہر پہلو سے انشورنس کا محتاج ہے۔

بیمہ — بطور ایک اقتصادی ادارے کے! مگر یہاں ہمیں بیمہ یا انشورنس کو ایک اقتصادی ادارے (ECONOMIC INSTITUTION) کی حیثیت میں لے کر زیرِ غور لانا ہے۔ دورِ حاضر کے اقتصادی نظام کا یہ ایک نہایت ہی اہم شعبہ ہے جسے تجربات کی روشنی میں بہت دُور تک نشوونما دی جا چکی ہے۔ انسان میں اقتصادی پہلو سے پس اندازی کا رجحان پایا جاتا ہے پس اندازی کے اس رجحان سے جہاں مالیاتِ عامہ (PUBLIC FINANCE) کی تعمیر و ترقی میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور بنک کاری کے لیے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ اس کو بروئے کار لا کر سمیٹا جاتا ہے وہاں اسی کے بل پر انشورنس کا سارا کاروبار چلتا ہے۔ مگر پس اندازی مختلف مقاصد کے لیے ہو سکتی ہے۔ ان مقاصد میں سے ایک

بڑا مقصد مستقبل کے اندیشہ ہائے زیاں کا سدباب ہے۔ پس اندازی کے ساتھ جب یہ مقصد شامل ہو جاتا ہے تو انشورنس کے ادارے کے لیے بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی عالمِ اقتصادیات پس اندازی کے سارے مقاصد کو ان الفاظ میں جمع کر لیتا ہے:

" PROVIDE AGAINST FUTURE. (یعنی مستقبل کی ضروریات پوری کرنے کے لیے حصول استطاعت!)۔

پھر وہ انشورنس کے لیے مخصوص نوعیت کی پس اندازی کی تعریف یوں کرتا ہے:

" D. PROVIDE AGAINST UNEXPECTED " (غیر متوقع، نامعلوم یا ناگہانی حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے حصولِ استطاعت ہے)[1]

بہت سے حوادث اور اندیشے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا مقابلہ ایک فرد یا ادارہ تنہا اپنی بچتوں کے بل پر کر لے جا سکتا ہے۔ لیکن ناگہانی آفات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کو افراد اور ادارے تنہا اپنی بچتوں کے بل پر سہار نہیں سکتے۔ ایسی آفات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کو تعاون کر کے کوئی اجتماعی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ایسی ہی ایک اجتماعی صورت انشورنس کمپنیاں ہیں۔ گویا بیمہ کا موجودہ نظام کار جس فارمولے پر مبنی ہے وہ یہ ہے:۔

پس اندازی برائے انسدادِ حوادث + نظامِ تعاون = (بالفاظِ دیگر) اجتماعی پس اندازی۔

انشورنس کے نظام کا طریقِ کار یہ ہے کہ ایک فرد کی مصیبت کے بار کو بہت سے افراد پر پھیلا دیا جائے اور ہر ایک کو خفیف سی قربانی دینی پڑے۔ لیکن اس قربانی کے عوض میں جملہ افراد کو ویسا ہی تعاون حاصل ہو۔

بیمہ کے ادارات کا نشوونما اس موضوع پر اب تک کی تحقیقات سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ شہادت دیتی ہیں کہ بیمہ کے نظام کی جو کچھ ابتدائی شکل پیدا ہوئی وہ تاجروں اور کاروباری حلقوں میں پیدا ہوئی۔ علی الخصوص تجربات کا آغاز بحری تجارت سے ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ دورِ جدید سے قبل سرمایہ

---

[1] مراد ہے چارلس گائیڈ۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب " POLITICAL ECONOMY "

کی زیادہ سے زیادہ مقداریں تجارت کے دائرے میں مجتمع ہوتی تھیں۔ پھر چونکہ بحری تجارت کی صورت میں ناقص وسائل کی وجہ سے بادبانی جہاز اور کشتیاں اکثر طوفانوں کا لقمہ بن جاتی تھیں اور لاکھوں میں کھیلنے والے خاندان اچانک کنگال ہو کے رہ جاتے تھے، اس لیے بحری تاجروں میں سب سے پہلے تحریک ہوئی کہ وہ ناگہانی حوادث کی تباہ کاریوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔ بڑی حد تک یہ روایت قابلِ وثوق ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی۔

دورِ جدید کی حد تک ہالینڈ اس تجربے میں پیش پیش نظر آتا ہے جہاں کے مالکانِ جہاز، بحری تاجروں متاعوں اور زراعت کاروں (جن کا مفاد جہازوں کی تباہی سے یکساں طور پر متاثر ہوتا تھا) نے مل جل کر کاروباری بیمہ کے اس ابتدائی سسٹم کو اختیار کیا جسے اصطلاحاً "گارنٹی ایسوسی ایشن" (GUARANTEE ASSOCIATION) کہا جاتا ہے۔ اس سسٹم کے شرکا کسی بھی حصہ دار کو پیش آمدہ نقصان کے مقابلے میں "حصۂ رسدی" کی ادائی کرکے بحال رکھتے تھے۔ اسی نظامِ کار کی جدید ترقی یافتہ شکل لائیڈز (LLOYDS) سسٹم کہلاتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی دوسری اہم اور مقبول شکل مشترک نظامِ بیمہ (MUTUAL INSURANCE) کے نام سے رائج ہے۔ جس میں بیمہ دار ہی کاروبار کے حصہ دار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس نئے سسٹم میں "حصۂ رسدی" کی ادائی کا قدیم طریقہ برقرار نہیں رہا۔

موجودہ دور میں ایک مقررہ چندہ پر بیمہ کاری (FIXED PREMIUM) کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کو "سرمایہ کارانہ نظامِ بیمہ" (CAPITAL FORM OF INSURANCE) بھی کہا جاتا ہے۔

ان بے شمار تجربات سے گزرتے ہوئے بیمہ کی سب سے وسیع الاثر اور ہمہ گیر شکل وہ اختیار کی گئی ہے جو ریاستی نظامِ بیمہ (STATE FORM OF INSURANCE) کے نام سے موسوم ہے اور جس کے تحت حکومت شہریوں کو خاص خاص حوادث اور مصائب کے مقابلے میں تحفظ اور انسداد کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب جان، املاک، خاندان اور کاروبار سے متعلقہ کوئی مد ایسا نہیں رہا جس کو جدید نظامِ بیمہ نے اپنے سایۂ تحفظ میں نہ لے لیا ہو۔

بیمۂ زندگی | بیمۂ زندگی ــ یا لائف انشورنس ــ کا آغاز انگلستان سے ہوا۔ اس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ

متوفی (خصوصاً جبکہ وہ نادار ہو) کی تجہیز و تکفین کا بار اٹھاتا تھا۔ بعد میں اس کا دائرہ وسیع ہوا اور بیوگان اور یتیموں کی کفالت کی راہیں نکالی گئیں۔ اشخاص کو حوادث — خصوصاً — موت کے مقابلے میں قرض کی صورت میں مالی سہارا پہنچانے کے لیے مختصر مدت کے نظام جیسی پہلی معلوم شدہ نظیر ۱۵۸۳ء میں ملتی ہے۔ باقاعدہ بیمۂ زندگی کی ابتدا پہلے پہل انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ سے ہوئی۔ پچھلی صدی میں اس ادارے نے اتنی تیزی سے پھیلاؤ اختیار کیا کہ ۱۸۷۰ء میں لائف انشورنس ایکٹ پاس ہوا جس کا مدعا بیمہ داروں کے مفادات کا تحفظ تھا۔

بیمہ کمپنیوں کی دو بنیادی نوعیتیں ہیں:۔ ایک سرمایہ کارانہ (PROPIETORY) اور دوسری اشتراک دارانہ (MUTUAL)۔ اول الذکر کمپنیوں کا منافع حصہ داروں کو ملتا ہے اور بیمہ کاروں سے ان کا معاملہ طے شدہ شرائط پر بیمہ کی حد تک ہوتا ہے۔ موخر الذکر کے بیمہ دار ہی حصہ دار بھی ہوتے ہیں، لہٰذا پورا منافع بھی انہی میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً چھوٹے چھوٹے حصہ داروں کی کثیر تعداد کے پلّے منافع کا بہت ہی قلیل جزو پڑتا ہے اور چند بڑے بڑے سرمایہ کار ہی اعلیٰ مناصب پر رہ کر معاوضے اور مروجہ مفاد بھی حاصل کرتے ہیں اور منافع میں سے بھی زیادہ حصّے لے جاتے ہیں۔

بیمۂ زندگی کے دو بڑے شعبے ہیں: ایک صنعتی، دوسرا عمومی۔ زیادہ تر کمپنیاں دوسرے ہی شعبے کا کاروبار کرتی ہیں اور صنعتی بیمہ کاری کا کام محدود ہے۔ صنعتی بیمۂ زندگی کے لیے چندۂ بیمہ (پریمیم) کی چھوٹی چھوٹی مقداریں ہفتہ وار یا ماہانہ اقساط میں لی جاتی ہیں تاکہ مزدور لوگ آسانی سے ادائیگی کر سکیں۔ لیکن عمومی بیمۂ زندگی کا چندہ سالانہ، ششماہی وار یا سہ ماہی وار اقساط میں لیا جاتا ہے۔

بیمۂ زندگی کی بہت سی شکلوں کو دو بڑی اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک مع منافع، دوسری بلا منافع۔ بیمہ اگر کسی مع منافع اسکیم کے تحت کرایا گیا ہے تو بیمہ دار کا حق کمپنی کے مجموعی منافع پر قائم ہو جاتا ہے اور بیمہ کی رقم کے ساتھ وہ مقررہ وقفوں پر بونس کے طور سے ایزاد ہوتا رہتا ہے۔ اسے نقد برآمد کرنے کی سہولت بھی پیدا کی گئی ہے۔ لیکن کسی بلا منافع اسکیم کے تحت بیمہ کرانے پر اس طرح کا کوئی استحقاق نہیں ہوتا۔ قدرتی طور پر اس صورت میں چندۂ بیمہ کی مقدار بھی کم ہوتی ہے۔

"لائف پالیسی" (جسے ٹرم پالیسی بھی کہا جاتا ہے) کی صورت میں جو بیمہ کرایا جاتا ہے اس کی سادہ ترین شکل یہ ہے کہ ایک مقررہ رقم بیمہ دار کی موت واقع ہونے پر اس کے پسماندگان کو ادا کی جاتی ہے۔ اس سے اگلی صورت ہول لائف پالیسی کی ہے جس کے تحت چندہ ادا کرنے کی مقررہ مدت کے خاتمے سے پہلے جب بھی بیمہ دار کی موت واقع ہو جائے اس کے پسماندگان کو معاہدہ کی رقم ملے گی۔ پھر اس سے آگے کی مقبول شکل "معاہدۂ وقف" (ENDOWMENT POLICY) کی ہے جس کی رُو سے بیمہ دار کو ایک مقررہ مدت کے پورا ہونے پر، یا اگر اس سے پہلے کسی بھی وقت اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے پس ماندگان کو ادائیگی کی جاتی ہے۔

ان ساری بنیادی اشکال کو دوسرے بہت سارے مفادات کے ساتھ مرکب کر کے ان گنت اسکیمیں ایجاد کی گئی ہیں جو دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر رائج ہیں۔ مثلاً بیمۂ زندگی کی مرکب پالیسیوں کے تحت شادی، بچوں کی تعلیم، زچگی اور اسی طرح کی دوسری ضروریات کے لیے خاص امدادی رقوم یا وظائف بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ بیمہ دار کے لیے مفادات جتنے جتنے بڑھتے جاتے ہیں مقدارِ چندہ بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

یہاں ان اقسام کو تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں۔ اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ ایک حقیقی ضرورت کے تحت اس ادارہ کو اتنی نشوونما اور وسعت حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں سے جب بار بار بے شمار ایسے عبرت ناک واقعات گزرتے ہیں کہ ایک خاندان کے کماؤ فرد کی موت بسا اوقات کامل معاشی تباہی اور مفلوک الحالی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا حالِ زار دیکھ کر ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو اس قسم کے ابتلا سے بچانے کی کوئی تدبیر جیتے جی کر لے۔ گویا بیمہ کی دوسری اقسام کی طرح بیمۂ زندگی ایک تمدنی ضرورت ہے۔ ہر تمدنی ضرورت چاہتی ہے کہ اسے پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستے نکلنے چاہییں۔ اگر صحیح راستے نہ کھولے جائیں گے تو غلط راستے ضرور نکلیں گے۔

بیمہ اور اسلام اسلام نے انسانی فطرت کے ان محرکات کو نظرانداز نہیں کیا جو مصائب اور نقصان کے اندیشوں کا سدِّباب اور ان کے مقابلے میں تحفظ مانگتے ہیں۔ چنانچہ اسلام نے اس حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایسی وسیع اور جامع شکل عملاً اختیار کر کے دکھائی ہے کہ جس کی مثال کسی دوسرے

نظامِ حیات نے نہ نظریاتی دائرے میں پیش کی اور نہ عملی اور واقعاتی تاریخ میں!

مدینہ کی اسلامی ریاست پورے مسلم معاشرہ کے لیے از سرتا پا ایک انشورنس سسٹم تھی۔ معاشرہ کا ہر رکن اس کا وثیقہ دار یا پالیسی ہولڈر تھا۔ ہر رکن کو اندوختے، زرعی پیداوار، کاروباری سرمائے اور مواشی کی مقداروں کے مطابق ایک مقررہ شرح سے چندۂ سالانہ (پریمیم) ادا کرنا لازم تھا۔ ریاست اس انتظام کے بل پر کسی ایک نوع کے حادثے یا اندیشے (RISK) کا محدود تحفظ بہم نہیں پہنچاتی تھی بلکہ معاشی دوڑ میں گر پڑنے والے ہر فرد کو ہر حال میں سہارا دیتی تھی۔ ہر بیوہ، ہر یتیم، ہر ضعیف، ہر معذور، ہر طفلِ شیر خوار، ہر بیمار، اور ہر بے روزگار کے لیے یہ ایک اجتماعی نظامِ کفالت تھا۔ اس معاشرہ کا ایک رکن زندگی کا فرض انجام دیتے ہوئے اس فکر میں ایک لمحہ نہیں گنواتا تھا کہ کہیں وہ مفلوک الحال نہ ہو جائے یا اس کے بیوی بچے اس کی موت کے بعد در در کے دھکے نہ کھاتے پھریں۔ اس کے تمام بنیادی مفاد بیمہ شدہ (INSURED) تھے۔ اسے یقین تھا کہ میرے بچوں کو تعلیم مفت ملے گی، انصاف مفت ملے گا، میں نہ رہوں گا تو ان کے نان و نفقہ کا انتظام کرنے کے لیے ایک نظامِ اخوت موجود ہے۔ میرا کاروبار اگر تباہ ہو جائے گا تو میری بحالی میں اجتماعی نظام مدد دے گا۔ غرضیکہ شومیٔ قسمت کی تمام غیر اختیاری صورتوں کا احاطہ اسلامی نظامِ تحفظ نے کر لیا تھا۔ افراد کے قرضوں، تاوانوں اور دیت کی ادائی تک کا بار اسلام نے اجتماعی ہیئت کے سر ڈالا ہے۔

ریاستی نظامِ بیمہ (STATE INSURANCE) کی اس ہمہ گیر شکل کے علاوہ ایک فرد کی ناگہانی مصیبت کے مالی بار کو قریبی حلقے میں پھیلا دینے کی اوّلیں ایجاد بھی باقاعدہ طور پر عرب میں ہوئی تھی اور اسے اسلام نے اپنا کر آئینی حیثیت دے دی۔

قتلِ خطا کی صورت میں کسی فرد پر اگر تاوان (دیت) کا بار آ پڑتا تھا تو اسے پھیلا دینے کے لیے "نظامِ مَعَاقِل" (مَعْقُلَہ بہ معنی دِیَت یا تاوان کی جمع) برسرِ عمل تھا۔ اس نظام کو مدینہ کے اوّلیں تحریری دستور میں باقاعدہ قانونی (LEGAL) حیثیت دے دی گئی تھی[1]۔ مدعا یہ کہ مقتول کے خوں بہا کی ادائی

---

[1] الفاظ یہ ہیں:۔ ھٰذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المؤمنین والمسلمین من قریش واھل[4]

میں ایک شخص کے قرابت مند شریک ہوں تاکہ شرح ہدایہ کے الفاظ میں فی کس ۳-۴ اور ۴ درہم سے زیادہ کا بار نہ پڑے[1]

ایسے ناگہانی مالی بار کو نہ صرف یہ کہ نظام معاقل کے تحت کثیر افراد میں بانٹا جاتا ہے۔ بلکہ اسے تین سال کی وسیع مدت پر بھی پھیلایا جاتا ہے۔

کسی ایسے نادار آدمی پر اگر دیت آجائے جو کوئی قرابتی حلقہ نہ رکھتا ہو تو اس کی دیت کا بار بیت المال

۴۔ یثرب ومن تبعھم فلحق بھم، فحل معھم وجاھد معھم، انھم امۃ واحدۃ دون الناس، المھاجرون من قریش ــــ علی ربا عتھم یتعاقلون بینھم معاقلھم الاولی وھم یفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المومنین والمسلمین" (کتاب الاموال)

[1] یہ ہمارے نظام فقہ و قانون کا ایک مستقل مبحث رہا ہے۔ ۔ ۔ نظام معاقل کے تحت ایک شخص کے مالی بار میں فقہا کے نزدیک مختلف قرابتوں کی بنا پر اس کے تعلق دار شریک ہوتے ہیں۔

"الدیۃ علی اھل العشیرۃ" یعنی دیت کا بار قبیلہ داروں پر ہے۔ پھر وہ اس عموم میں یوں اختصاص پیدا کرتے ہیں کہ: امام شافعی کہتے ہیں کہ "العاقلۃ اھل الدیوان" یعنی وہ تمام اقربا ایسی ذمہ داریوں میں مشترک ہیں جن کے نام سرکاری رجسٹر میں درج ہوں۔ یہ گویا بلوغ اور استطاعت کا ایک معیار تھا۔

شرح ہدایہ میں ہے کہ "ان العقل کان علی اھل النصرۃ وقد کانت بانواع بالقرابۃ والحلف والولاء والعد" یعنی تاوان کی ذمہ داری ان پر ہے جو مختلف قرابتوں، معاہدوں، دوستداریوں کی بنا پر باہم دگر حمایتی ہوں یا کسی پیشہ ور میں اشتراک رکھتے ہوں۔ شرح ہدایہ ہی میں یہ پہلو بھی مذکور ہے کہ اگر کچھ لوگ کسی حرفہ (TRADE) کی بنا پر مشترک مفاد رکھتے ہوں اور اس کی بنا پر آپس میں حمایتی ہوں تو پورے اہلِ حرفہ پر تاوان کا بار پھیلایا جائیگا اسی طرح اگر سکونت کی یکجائی بنائے تعاون ہو تو اس صورت میں ایک بستی (یا علاقے کے لوگ دیتوں میں شریک ہونگے

نوٹ:- مذکورہ بالا قرابتوں کی روشنی میں اگر جدید تجربات و ضروریات کو سامنے رکھ کر اجتہادی ذہن سے کام لیا جائے تو بیمہ یا امداد باہمی کی کسی تنظیم کے شرکا بھی ایک دوسرے کے نقصانات میں حصہ دار ہو سکتے ہیں، خصوصیت سے اس معاہدہ کی بنا پر جس کے تحت وہ منظم ہوئے ہوں۔

مسلم معاشرہ پر عائد ہوتا ہے، یعنی اسے بیت المال ادا کرے گا۔ درحقیقت اسی نظام معاقل سے رہنمائی لے کر اندلس کی مسلم حکومت کے عہد میں مسلمان تاجروں اور بحری کشتیوں کے مالکوں نے گارنٹی ایسوسی ایشن کے طرز پر کاروباری سسٹم کی راہ نکالی تھی۔

پس اس نظام معاقل کی نظیر کو سامنے رکھا جائے تو جہاں غرقابی، آتشزدگی، صنعتی حادثات، اور دیگر مصائب و آفات کی وجہ کسی فرد پر آپڑنے والے اقتصادی بار کو ایک وسیع تنظیمی حلقۂ قرابت پر پھیلایا جا سکتا ہے وہاں بیوگی، یتیمی، مفلوک الحالی بے روزگاری، ناکارگی کے معاملہ میں بھی اشتراک و تعاون کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔ نیز تعلیم، شادی، زچگی اور زندگی کے دوسرے گراں بار معاملات میں لوگوں کے امداد باہمی کے اصول پر تحفظ کی فضا تشکیل دینے کا موقع حاصل ہے۔

موجودہ نظام بیمہ اور اسلام اب تک کی گفتگو سے شاید میں نے ضروری حد تک یہ وضاحت کر دی ہے کہ اصولاً بیمہ یا انشورنس ضروری اور مفید ادارہ بھی ہے اور اسلام کے مطابق بھی۔ بدقسمتی سے بہت سے اصحاب بحث کو یہاں لاکر ختم کر دیتے ہیں۔ خصوصاً بیمہ کمپنیوں کا جو اشتہاری لٹریچر میری نگاہ سے کبھی کبھار گزرتا رہا ہے اس میں علماء تک کی تصدیق کے ساتھ اصولاً یہ مجمل حقیقت پیش کر دی جاتی ہے کہ اسلام بیمہ کا مخالف نہیں۔ اس کے بعد مروّجہ نظام بیمہ کی مختلف اسکیمیں درج کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح ہزارہا افراد بڑے بھاری مغالطے کا شکار ہوتے ہیں۔

میں اس اصولی بحث سے آگے جانا چاہتا ہوں۔ اور جہاں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام اصولاً نظام بیمہ کا مخالف نہیں ہے، وہاں میں اس امر واقعہ کو بھی کھول کر رکھ دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ نظام بیمہ سخت فاسد ہے اور اسلام سے پوری طرح متصادم ہے۔ غالباً میری گفتگو کا اہم ترین حصّہ یہی ہے۔

یہ تو آپ پر خود روشن ہے کہ ہمارا موجودہ نظام بیمہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے شجر خبیثہ کا ایک ٹہنا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بنکوں کے ساتھ ساتھ بیمہ کمپنیاں اس کی جڑوں کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ یہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک عجیب ذہنی تضاد ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ معیشت کے مجموعے کے خلاف تو شدید انتہا پسندانہ انقلابی رائے رکھتے ہیں، لیکن اسی منحوس کُل کے اجزا کو الگ الگ لے کر

وہ مطابق اسلام بھی ثابت کرتے پھرتے ہیں۔ اس دلچسپ مشغلے میں اگر کوئی ان کا ساتھ نہ دے تو اسے وہ تاریک خیال ملّا قرار دیتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سُور کو مجموعی طور پر حرام تسلیم کرنے کے بعد آپ اس کی مختلف بوٹیوں کی حلت کا فتویٰ دیں۔ یہ فکری تضاد ایک شاندار مضحکہ ہے۔

بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کے دو پہلو بیمہ کمپنیوں کے اشتہاری لٹریچر کو پڑھیئے تو تاثر یہ ہوتا ہے کہ مالکان کچھ بڑے ہی خدا ترس اور خدام انسانیت ہیں کہ بیمۂ زندگی کی مختلف اسکیموں کے ذریعے بندگان خدا کو مصائب سے بچانے کا انتظام کرتے ہیں۔ نیز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مفاد کا بہت بڑا حصّہ پبلک (بیمہ داروں) کی جھولی میں جاتا ہے۔

حالانکہ بیمہ کمپنیوں کا کاروبار دوگونہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ افراد اور اداروں کو نقصانات اور اندیشوں کے مقابلے میں تحفظ بہم پہنچاتی ہیں۔ دوسری طرف وہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کے کارفرما طبقے کو ہر چہار جانب سے سرمایہ نچوڑ نچوڑ کر فراہم کرتی ہیں۔

پبلک کے سامنے صرف ایک پہلو لایا جاتا ہے اور دوسرا ہمیشہ تاریکی میں رہتا ہے۔ ترازو کا ایک پلڑا دیکھ کر آپ صحتِ وزن کا یقین حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بیمہ کرانے والی پبلک کے سامنے بھی ہمیشہ ایک ہی سوال رہتا ہے کہ ہمیں کیا ملے گا، یہ دوسرا سوال کبھی زیر غور نہیں آتا کہ ہمارے روپے سے فائدہ کیا اٹھایا جائے گا۔

جہاں تک بیمۂ زندگی کا تعلق ہے، اس کا کاروبار بیشتر درمیانہ اور غریب طبقہ کی چھوٹی بچتوں پر چلتا ہے۔ اقتصادی حیثیت سے جو طبقے اچھے حالات رکھتے ہیں ان کے سامنے یہ اندیشہ ہوتا ہی نہیں کہ وہ بڑھاپے یا ناکارگی میں پڑ کر مشکلات سے دوچار ہونگے یا ان کی موت پر ان کے بیوی بچے مفلوک الحالی کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا ان کے لیے بیمۂ زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ اپنے سرمایے (یا بچتوں) کو کسی اچھے کاروبار میں لگا کر اپنا بیمہ کرانے سے کہیں زیادہ مفاد حاصل کر سکتے ہیں اور مستقبل کا تحفظ بہم پہنچا سکتے ہیں۔ وہ اگر بیمۂ زندگی کراتے ہیں تو یا تو اس وجہ سے کہ ان کو بیمہ کے کاروبار میں شریک بننا ہو یا مستقبل کی ترغیب دہانی سے۔ البتہ غیر کاروباری عہدے دار بیمۂ زندگی سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ بیمۂ زندگی کے

لیے زیادہ تر کشش درمیانہ اور غریب طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ بیمہ کمپنیوں کا لٹریچر ایک طرف ان کو موت اور بڑھاپے اور دوسری آفات سے خوف زدہ کرتا ہے اور دوسری طرف مفاد اور تحفظ کی جانب ترغیب دلاتا ہے۔ سوسائٹی کے نچلے طبقوں کے لوگ اپنی قلیل آمدنیوں میں سے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر چھوٹی بچتیں نکالتے ہیں اور یہ بچتیں معاشرے میں سے رِس رِس کر بیمہ کمپنیوں کے پاس جمع ہوتی ہیں۔ بیمہ کمپنیاں غریبوں سے نچوڑے ہوئے اس بیش بہا سرمائے کو یونہی نہیں ڈال رکھتیں بلکہ آگے اسے کاروبار پر چڑھاتی ہیں۔

اقتصادیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انشورنس کمپنیاں "بازارِ زر" (MONEY MARKET) کا ایک بڑا وسیع اور اہم حصہ ہیں۔ ایک مقولے کے مطابق :-

(HANDLE VAST AMOUNTS OF CAPITAL)[1] " سرمایہ کی بہت بڑی مقداروں کو زیرِ تصرف رکھتی ہیں)۔

اس کی توضیح کے لیے یہ جاننا موجب دلچسپی ہوگا کہ ۱۹۵۳ء کے ایک ہی برس میں امریکہ کی بیمہ کمپنیوں کو وثیقہ داروں کے چندہ سے ۱۰ ارب ۸ کروڑ ۴ لاکھ ڈالر کی رقوم وصول ہوئیں۔ اس سال میں ان کے پاس جو اثاثے تھے ان کی مالیت ۷۸ ارب ۲۰ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر تھی۔ پریمیم، سود اور منافع سے ان کمپنیوں کی جملہ آمدنی ۱۴ ارب ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر تھی۔ اس میں سے سالِ مذکور میں انہوں نے صرف چار ارب ۴۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر وثیقہ داروں کو ادا کیے۔ باقی ۱۰ ارب سے زائد رقم میں سے اپنے مصارف نکالنے کے بعد ایک وسیع مقدار سرمایہ کاری کے لیے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء ہی میں برطانیہ کی انشورنس کمپنیوں کو چندوں (پریمیم) سے ۱ ارب پونڈ کی رقوم موصول ہوئیں اور ان کے اثاثوں کی مقدار ۳ ارب پونڈ تھی۔ برطانیہ کی بیمہ کمپنیوں نے ۱ ارب ۲۰ کروڑ پاؤنڈ کی حد تک سرکاری اور پبلک دائروں میں اور ۹۰ کروڑ پاؤنڈ کی حد تک کاروباری حصص کی صورت میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔

بیمہ کمپنیوں کے پاس اتنی بڑی مقدارِ سرمایہ جمع ہو جاتی ہے تو وہ اس بھاری اقتصادی قوت کو زیرِ

[1] یہ الفاظ (SHEPARD. B. CLOUGH) کے ہیں۔ ملاحظہ ہو: THE AMERICA WAY

اصلاً وثیقہ داروں کی ملک ہے)۔ مٹھی بھر اونچے سرمایہ داروں کے قدموں میں جا ڈالتی ہیں۔ خواہ وہ اس سرمایہ کو بنکوں میں رکھیں (اور بنک صنعتی اور کاروباری میدانوں میں اسے نفع آوری کے لیے لگائیں)، یا کاروباری حصص کی خرید میں لگائیں یا سُود پر اسے بڑے تجارتی اداروں کو سونپیں، ہر جگہ نفع چُوس سرمایہ دار بیٹھا ہُوا ہے۔ جو سرمایہ کی مستعار قوت سے حاصل شدہ منافع کا بڑا حصّہ خود رکھ کر قلیل سا حصّہ سرمایہ کاروں کے لیے بھی نکال دیگا۔

پس بیمہ کا کاروبار اگر دو پہلو رکھتا ہے تو اس کی منفعت بھی دو جانب سے دیکھی جانی چاہیے اور دونوں پلڑوں کا پورا پورا موازنہ ہونا چاہیے۔

سرمایہ دار طبقہ کا حصّہ | غریبوں کے خون کی بوند بوند کو نچوڑ کر انشورنس کمپنیاں جو سرمایہ حاصل کرتی ہیں وہ براہِ راست یا بنکوں کی معرفت جب سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو اس سے کاروبار کی معمولی رفتار کے تحت ۱۵ سے ۲۵ فیصد تک منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس حاصل شدہ منافع میں سے فرموں کے مالکان اور مختلف صنعتی و تعمیری شعبوں کے اجارہ دار حد سے حد ۴، ۵ فیصدی کی حد تک بنک کو لوٹا دیتے ہیں۔ بنک اس میں سے اپنا حصہ رکھ کر (مقررہ شرح کے مطابق ۲، ۳، ۴ فیصدی) بیمہ کمپنیوں کو دیتا ہے۔ بیمہ کمپنیاں اس میں سے اپنے بھاری مصارف بھی نکالتی ہیں اور کچھ مقدار نفع بھی رکھتی ہیں۔ وثیقہ داروں (یعنی سرمایہ کے اصل مالکوں) کو مشکل ½ یا ۱ فیصدی کے حساب سے منافع ملتا ہے۔

بطورِ مثال یہ سامنے رکھیے کہ امریکہ کی انشورنس کمپنیوں نے ۱۹۵۳ء میں حکومت کے بانڈز، سرکاری اور دوسرے کاروباری قرضوں میں (جن کی شرح بہت اچھی تھی) ۸ ارب ڈالر کا سرمایہ لگایا، درآنحالیکہ (اوپر بیان کیا جا چکا ہے) پریمیم کی جملہ آمدنی ۱۰ ارب ۸ کروڑ، ۴ لاکھ ڈالر تھی۔ اسی سال میں ان کمپنیوں کو سُود اور کاروباری منافع کے طور پر ۳ ارب ۲۴ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کی رقم حاصل ہوئی۔ منافع کی یہ وہ رقم ہے جو بڑے بڑے کاروبار چلانے والے اونچے سرمایہ داروں کے اصل وسیع منافع کا ایک قلیل تر جزو ہے۔ لیکن بجائے خود یہ قلیل تر جزو جو انشورنس کمپنیوں تک پہنچتا ہے، بہت

گراں بہا ہے۔

اب سے چند ہی برس پہلے انگلستان کی پانچ انشورنس کمپنیوں کی پنج سالہ کاروبار میں منافع کا اوسط ۵ فیصد تھا۔ ۵ ٪ شرح سے (سود مفرد کے طریق پر) ایک رقم ۲۰ سال میں دگنی ہو جاتی ہے۔ ۵ ٪ کے حساب سے اپنی بھاری مقدارِ سرمایہ پر کمائے ہوئے سود در سود میں سے بیمہ کمپنیاں اپنے شاہانہ مصارف اور ڈائرکٹروں اور ایجنٹوں کے مسرفانہ معاوضے اور کمیشن اور سفر خرچ نکالنے کے بعد بیمہ حصہ داروں کے لیے منافع بھی الگ کرتی ہیں۔ آخر میں تھوڑا سا تلچھٹ بچ جاتا ہے وہ وثیقہ داروں پر ارزانی فرما دیا جاتا ہے۔

سودی نظام کا یہ خاصہ ہے کہ وہ سرمایہ کی قوت کو ہر طرف سے سمیٹ کر بالائی طبقے کی تحویل میں دے دیتا ہے اور منافع کی بڑی مقدار اس کی جھولی میں ڈالتا ہے۔ ہماری انشورنس کمپنیاں سودی بنک کاری کے نظام کا ایک سفینہ ہیں۔ لہٰذا سود کی لعنت ان کے کاروبار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے وثیقہ داروں کو کیا ملتا ہے اب ہمیں یہ اندازہ کرنا ہے کہ متوسط اور غریب طبقے کے ان وثیقہ داروں کو کیا ملتا ہے جن کی خون پسینے کی کمائی سے انشورنس کمپنیاں، بنک اور بڑے بڑے کاروباری ادارے اور ان سب پر چھائے ہوئے مٹھی بھر سرمایہ دار دل کھول کر نفع سمیٹتے ہیں۔ اس کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ آپ کسی بھی بیمہ کمپنی کے پراسپکٹس اٹھا کر دیکھیں، اس کی کسی بھی اسکیم کا حسابی تجزیہ کریں، ساری حقیقت آپ سے آپ کھل جائے گی۔ مرکب صورتوں کو چھوڑ کر کسی سادہ ترین اسکیم کو لے لیجیے مثلاً میرے سامنے ایک خاص کمپنی کی اسکیمیں رکھی ہیں۔ پراسپکٹس کے صـ۱۱ پر ۱۰۰۰ روپے کے بلا منافع بیمہ کی اسکیم دی ہوئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت جو مختلف شکلیں مندرج ہیں ان میں سے سادہ ترین ۲۰ سال کی عمر میں ۴۰ سال کی حدِ عمر تک کا بیمہ کرانے کی ہے۔ سالانہ چندہ (پریمیم) ۵۰/۱۴ روپے ہے۔ اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اسی مذکورہ بالا اوسط کے مطابق ایک بیمہ کمپنی کو اپنے جمع شدہ سرمایے پر ۵ ٪ سود یا منافع حاصل ہوتا ہے تو پہلی قسط سود مفرد کے قاعدے سے مدتِ معاہدہ کے پورا ہونے پر دگنی ہو جائے گی۔ آئندہ ہر قسط کی مقدارِ منافع ہلکی تدریج سے کم ہوتی جائے گی۔ یہاں تک

کہ آخری قسط پر منافع تقریباً بقدرِ صفر ہوگا۔ خیال رہے کہ عملاً یہ کاروبار شر... رسود کے اُ... پر چلتا ہے جس کے تحت بڑھوتری کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اس طرح کمپنی بہت زیادہ آمدنی حاصل کر لے جاتی ہے۔

ایک اور اہم پہلو آپ سوچیں گے کہ آخر ایسے وثیقہ دار بھی تو بہت سے ہونگے جو اس مدت کے پورا ہونے سے قبل جاں بحق ہو جائیں اور کمپنی کو ان کی کم جمع شدہ رقم میں اپنے پاس سے کافی رقم ملا کر ان کے پسماندگان کو دینی پڑے۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر عام لوگوں کو معلوم نہیں کہ کسی رقم کا بیمہ کرتے ہوئے کمپنیاں عمر کے ساتھ ساتھ مدتِ معاہدہ اور پریمیم کی مخصوص مقدار باریک حسابات کی بنیاد پر مقرر کرتی ہیں اور اس کے لیے سالہا سال کے تجربات اور اعداد و شمار پیشِ نظر رکھ کر ماہرین ان کو رہنمائی بہم پہنچاتے ہیں۔ علاقوں کی آب و ہوا، خاندانوں کے حالاتِ صحت و مرض، عمروں کے اوسط اور شرحِ اموات کا پورا پورا لحاظ رکھ کر اسکیم بنائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں سب سے پہلے ۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۷ء کے درمیانی دور میں ایک خاص رہنما نقشہ[1] (CARLISLE TABLE) مرتب ہوا تھا۔ بعد میں مزید ترقی پا کر نئے نقشے (O.M. TABLE & H.M. TABLE.) سامنے آئے جن میں تازہ بہ تازہ معلومات کے تحت ترامیم کی جاتی رہتی ہیں۔ ان نقشوں کی روشنی میں کمپنیاں ہمیشہ ایسی اسکیمیں بناتی ہیں کہ ان کے مفاد کا پلّہ وثیقہ داروں کے بالمقابل بھاری رہے۔

مثلاً بیمہ کی مذکورہ بالا اسکیم میں ۲۰ سال کی عمر سے آغاز ہوتا ہے اور ۴۰ سال کی عمر تک اسکیم کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ برائے اعداد و شمار ۱۹۳۸ء کا نقشہ ہی اس وقت میرے سامنے ہے، برصغیر ہند و پاک میں ۲۰ اور ۴۰ سال کی عمر کے دوران میں مجموعی شرحِ اموات مردوں کی حد تک ۹ء۲۱ اور عورتوں کی ۶ء۲۵ فی ہزار ہے۔ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں صحت و تعلیم اور قومی دولت کے اضافہ کا لحاظ رکھیں تو اس عمر کے مردوں کی شرحِ اموات کو ہم ۲ فی ہزار سالانہ محسوب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سو مرد (بیمہ ہمارے ہاں زیادہ تر مرد کراتے ہیں) وثیقہ داروں کو لیں تو گویا بیچ میں جان بحق ہو جانے والوں کی تعداد سالانہ ۲ ہو گی۔

---

[1] اس کا مرتب (DR. HEYSLAM) تھا۔

اب اگر تفصیلی نقشۂ حساب مرتب کیا جائے تو پہلے سال کے چندہ کی آمدنی کمپنی کو ۵ ہزار روپے ہوگی جس میں سے سال آئندہ میں اوسطاً دو مرجانے والے وثیقہ داروں کو ۲ ہزار روپے کی رقم واپس کرنی ہوگی۔ گویا کمپنی کی تحویل میں مستقل طور پر ۳ ہزار روپے کی رقم رہ جائے گی۔ اسی طرح اگلے سال آمدنی (دو وثیقہ داروں کی کمی کی وجہ سے) ۴۹۰۰ روپے ہوگی اور سال میں دو نئے فوت شدگان کی پالیسی پر دو ہزار کی ادائیگی کی جائے گی اور کمپنی کے پاس اس سال میں سے قابلِ استعمال سرمایہ ۲۹۰۰ روپے رہ جائے گا۔ سابق ۳ ہزار کے ساتھ شامل ہو کر یہ جملہ رقم ۵۹۰۰ روپے ہو جائے گی۔ اس طرح ہر سال پریمیم کی آمدنی میں ایک سو روپے کی کمی ہوتی جائے گی اور اس میں سے دو ہزار کمپنی کے تصرف میں رہے گی۔ پہلے سال کے تین ہزار روپے ۲۰ سال پورے کرکے (مذکورہ بالا ۵ فیصد مجموعی شرح آمدنی کے حساب سے) بقاعدہ سود مفرد دگنے ہو جائیں گے۔ دوسرے سال کے ۲۹ سو روپے دُگنے سے ذرا کم رہ جائیں گے۔ تیسرے سال کے ۲۸ سو اس سے ذرا اور کم۔ چھٹے سال کے ۲۵ سو روپے پندرہ برس کاروبار میں رہ کر ۱۰۷۵ روپے بن جائیں گے۔ خیال رہے کہ عملاً کاروبار سود مرکب کے تحت ہوتا ہے جس سے بڑھوتری کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اگر ذرا کاوش سے حساب مرتب کیا جائے تو فقط پہلے ہی دس سال کے حاصل شدہ سرمایے (سالانہ دو وثیقہ داروں کی اموات پر ادائیگی کرنے کے بعد) پر کمپنی کی آمدنی بہت دور جا پہنچتی ہے۔

سالانہ ۲ اموات کے حساب سے ۶۰ وثیقہ دار ایسے ہوتے ہیں جو پورا ایک ہزار روپیہ جمع کراکے ۲۰ سال بعد اپنی ہی رقم بغیر کسی منافع کے واپس لیتے ہیں۔ گویا ان کی رقوم سے سارا فائدہ یا تو کمپنی کو پہنچا یا ان سرمایہ داروں کو جنہیں براہِ راست یا بنکوں کی معرفت کمپنی نے سرمایہ بہم پہنچایا۔ یہ بیچارے اس سارے منافع میں سے ایک پیسہ بھی نہ پاسکے۔

باقی ۴۰ وثیقہ دار رہ جاتے ہیں جن کو ایک ہزار سے کم ادائیگی کرنے پر ایک ہزار روپیہ مل جاتا ہے لیکن ان میں سے بھی ۱۹ ویں سال وفات پانے والے دو افراد کے لواحقین کو ۹۵۰ روپے فی کس کے عوض ایک ہزار ملیں گے اور اسی طرح اٹھارویں سال کے دو افراد کو ۹۰۰ اور سترھویں سال والوں کو ۸۵۰ ادا کرنے پر۔ علیٰ ہذا القیاس۔ درآنحالیکہ کمپنی ان کی پیش کردہ پونجی سے برابر ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ سال

کے لیے عرصے میں سود در سود کے زیرِ عمل نفع اندوزی کرے گی۔ اس نفع اندوزی کے عوض میں وہ ۱۹ ویں برس میں ۲ افراد کو ۵۰ روپے فی کس، ۱۸ ویں میں ۱۰۰ روپے فی کس، ۱۷ ویں میں ۱۵۰ فی کس، ۱۶ ویں میں ۲۰۰ روپیہ فی کس کا مَن پر سا کر نوازے گی۔ حالانکہ کسی شخص کا اگر ۵ صد روپیہ (۲۰ سال کی بڑھتی ہوئی اصل رقم کا اوسط لیتے ہوئے) ۵ بز منافع پر کاروبار میں لگتا تو ۲۰ سال میں وہ سود مفرد کے حساب سے بھی دگنا ہو جاتا اور اس کی خالص کمائی پانچ سو روپے ہوتی۔ ہمارا حسابی اندازہ یہ ہے کہ ۱۴ برس گزرنے کے بعد وفات پانے والے وثیقہ داروں کی ادائیگی کے لیے کمپنی کے سر کوئی بار نہیں پڑتا۔ حساب بالکل صاف ہے کہ ۱۴ برس کا چندہ (۷۰۰ روپے) ادا کر کے مرنے والے وثیقہ دار کے لواحقین کمپنی سے جو ۳۰۰ روپیہ پاتے ہیں وہ وثیقہ دار کے اندوختے پر اس عرصے میں حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر چودہ برس کے عرصے میں پہلے اور چودھویں سال پر اندوختے کی مجموعی مقداروں کا اوسط نکالا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ۳۵۰ روپے ۱۴ سال تک ۵ بز شرح کے حساب سے نفع آور بنے رہے۔ یہ آمدنی ۲۴۵ روپے بنتی ہے اور اصل اندوختے کے ساتھ مل کر میزان ۹۴۵ روپے ہو جاتی ہے۔ اب اگر حساب سود مفرد کے بجائے سود مرکب سے لیا جائے تو غالباً محض دس برس سے پہلے پہلے کی فونیدگیوں پر کمپنی کو بار اٹھانا پڑتا ہوگا۔ ایسے وثیقہ داروں کی کل تعداد ۲۰ بنتی ہے۔ ان ۲۰ میں سے آخری ۲ کو سرسری اندازے کے تحت یکصد روپیہ اور پہلے ۲ کو ۹ صد روپے دینا آسکتا ہے۔ یہ کل رقم تقریباً ۴۵۰۰ روپے بنتی ہے۔ اتنی آمدنی کمپنی کو اسکیم کی مدت میں پہلے ۶، ۷ سال کے چندوں کی رقوم سے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ بعد کے ۱۴ سالوں کے پریمیم سے حاصل شدہ سرمایے پر جتنا بھی سود یا منافع آتا ہے وہ سب کمپنی لے جاتی ہے۔ گویا خلاصہ یہ ہوا کہ:

- سو میں سے ۶۰ وثیقہ داروں کو ان کا اپنا اندوختہ بغیر منافع کے واپس ملا۔
- سو میں سے ۲۰ 〃 〃 〃 منافع سمیت واپس ملا۔
- سو میں سے ۲۰ 〃 کے اندوختہ اور اس کے منافع کے ساتھ کمپنی کو ۴۵۰۰ کی رقم پاس سے دینی پڑی۔

اب دیکھنا یہ ہے ۶۰ وثیقہ داروں کے پورے اندوختے (ایک ہزار روپیہ فی کس) سے ۲۰ سال میں کمپنی کیا کماتی ہے۔ ان ۶۰ وثیقہ داروں کا اندوختہ پہلے سال بقدر ۳ ہزار اور پھر تدریجاً ۵۰ روپیہ فی کس سالانہ بڑھتا ہوا سال آخر میں ۶۰ ہزار ہو جاتا ہے۔ اوسطاً گویا ۳۱ ہزار ۵۰۰ روپے ۲۰ سال تک ۵ فیصد آمدنی کا ذریعہ بنے رہے۔ سود مفرد کے قاعدے سے یہ رقم دگنی ہو جائے گی۔ یعنی ۳۱ ہزار ۵۰۰ سود آیا۔ سود مرکب کے حساب سے یونہی تخمینہ لگاتے ہوئے ہم اسے ۳۵۰۰۰ شمار کرتے ہیں۔ اس میں سے اسکیم کی مدت کے دوران میں بالاقساط ۱۴ ہزار ۵۰۰ روپیہ کمپنی نکال دیتی ہے۔ ۲۱ ہزار روپیہ کی بچت رہے گی۔[1] خیال رہے کہ ہم نے کم سے کم درجے کی سادہ اسکیم پیش نظر رکھی ہے۔

اب اگر ایک کمپنی نے مختلف اسکیموں کے تحت دس ہزار افراد کو اپنا وثیقہ دار بنایا ہو، ہزار سے لے کر دس ہزار روپے تک کی مختلف سادہ اور مرکب اسکیموں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایک اسکیم کا ذریعہ اوسطاً ۵ ہزار قرار پائے، نیز بطور مفروضہ ایسی کم سے کم ۵ کمپنیاں کام کر رہی ہوں تو اوپر کے حسابی اندازے کے مطابق اس کاروبار کی مجموعی بچت (وثیقہ داروں کا حساب ساتھ ساتھ ادا کرتے ہوئے) ۷ ارب ۵۰ کروڑ روپے ہو گی جس میں سے ایک ایک پائی کمپنی کے حصہ داروں اور کارندوں کی جیبوں میں جائے گی۔ یہ ساری کی ساری کمائی متوسط اور غریب طبقے کی نچوڑی ہوئی چھوٹی بچتوں سے حاصل کی جائے گی۔

حسابی جادوگری | اس تجزیہ سے اندازہ ہو گا کہ انشورنس کمپنیوں کے پراسپکٹس میں جو اسکیمیں دی ہوتی ہیں وہ

---

[1] بیمہ کے کاروبار سے متعلق ایک صاحب نے اس حسابی اندازے کو نظام بیمہ سے ناواقفیت پر مبنی قرار دے کر غلط ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے بالکل دوسری طرح توضیح کی۔ وہ بتانے لگے کہ اتنی رقم چندے کی ہم نے ایک شخص سے لی، اس میں سے اتنا ایجنٹ کو دیا گیا، اتنا کمپنی کے مصارف میں لگا، اتنا سرمایۂ محفوظ میں شامل ہوا۔ اس کے بعد جو باقی رہا، کمپنی نہ صرف وہ پورے کا پورا وثیقہ دار کو ادا کرتی ہے بلکہ الٹا ساتھ بہت سا منافع بھی دیتی ہے۔ ان کے حساب کے رو سے گویا پوری رقم ادا کرنے والے سو میں سے ۶۰ وثیقہ داروں کو بھی ان کا حق منافع سمیت لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ پھر ایک حسابی پھیر ہے۔ سیدھا صاف حساب یہ ہے کہ آپ نے کل رقم کیا وصول کی، اس پر کیا کمایا، اس میں سے کتنا ادا کیا۔ باقی منافع کیا رہا۔ اس منافع میں سے آپ کمپنی اور ایجنٹوں کے مصارف منہا کر کے بتائیے کہ خالص بچت کتنی ہوئی ہم کمپنی کے مجموعی کاروبار کو لیتے ہیں۔

ماہرین کی حسابی جادوگری کا کرشمہ ہوتی ہیں۔ عام آدمی یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے کیا امکانی فائدہ مل سکتا ہے اور کیا تحفظ حاصل ہو سکتا ہے، لیکن وہ اول تو یہ سوچ نہیں سکتا اور سوچے تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کے پیسے سے کمپنی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ پھر اس لائن کا اشتہاری لٹریچر بڑی نفسیاتی سحر کاری اپنے اندر رکھتا ہے۔ پڑھنے والے کو فائدے کا یہ پہلو تو نمایاں نظر آتا ہے کہ اگر وہ مدتِ بیمہ میں جاں بحق ہو جائے تو تھوڑی رقم کے عوض اسے بڑی رقم مل جائے گی۔ مگر وہ دوسرے رخ پر کم سوچتا ہے کہ وہ مدتِ بیمہ کو سلامتی سے گزر جائے اور اس کے اندوختے سے بہت بڑا فائدہ اٹھا کر کمپنی وہی جوں کا توں اسے واپس کر دے۔ پھر چونکہ چھوٹی بچتوں کو کاروبار میں لگانے کے راستے عام لوگوں کو نہیں ملتے اس لیے وہ انشورنس کمپنیوں کے دام میں آ جاتے ہیں۔

ایک نظامِ ظلم

اوپر کے تفصیلی تجزیے کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انشورنس کا موجودہ سسٹم جسے سرمایہ دارانہ نظام نے تشکیل دیا ہے ایک نظر فریب قسم کا نظامِ ظلم ہے۔ اس نظامِ ظلم کے تحت غریبوں سے اکٹھے کیے ہوئے سرمایے کا جاری منافع بڑے بڑے کاروباری اداروں، بنکوں اور خود انشورنس کمپنیوں میں بٹ جاتا ہے۔ نیز بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تو بڑی چیز ہوتے ہیں، ان کے ایجنٹ تک اتنے بڑے بڑے کمیشن اور سفر خرچ وصول کرتے ہیں کہ اونچے سے اونچے سرکاری عہدوں پر رہ کر اتنی کمائی نہیں کی جا سکتی۔ چند سال کی محنت سے جو ایجنٹ ایک مقررہ تعداد میں وثیقہ دار فراہم کر دیتا ہے وہ پھر بقیہ ساری عمر بغیر کام کیے اچھے معیار کی زندگی گزار سکتا ہے۔

انشورنس کمپنیوں کا پراپگنڈا لٹریچر اپنے اس کاروبار کو چمکانے کے لیے نظامِ بیمہ کو اخلاقی رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور اسے امدادِ باہمی کا عنوان دیتا ہے۔ حالانکہ چھوٹی بچتوں کے نکالنے والے وثیقہ دار اپنی جگہ امدادِ باہمی کے لاکھ ضرورت مند ہوں، کمپنیوں کی بنیاد بہرحال امدادِ باہمی کے اخلاقی اصول پر نہیں ہے، وہ تو کاروباری تنظیمیں ہیں جنہیں دوسروں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ بیمہ عام لوگوں کی مجبورانہ ضرورت سہی، مگر بیمہ کمپنیاں ان کی خدمت کرنے نہیں آتیں، ان کی پونجی کو سود پر چڑھا کر نفع اندوزی کرنے نکلتی ہیں۔ ایسے کاروباری اداروں کا دوسروں کو اخلاقی روح کا واسطہ دلانا بہت ہی ناقابلِ فہم بات ہے۔

اس سلسلے میں یہ مغالطہ بھی رفع ہو جانا چاہیے کہ میوچل انشورنس کے اصول پر بھی بیمۂ زندگی کا کام کرنے والی کمپنیاں عام آدمی کے حق میں کچھ زیادہ مختلف نوعیت نہیں رکھتیں۔ وہ بھی جمع شدہ سرمایے کو "بازارِ زر" میں سرمایہ دار عنصر کے ہاتھ کرائے پر چڑھا دیتی ہیں۔ ان کے ہاں بھی ڈائرکٹر، بڑے حصہ دار اور بڑی بڑی رقوم کی پالیسیاں زیادہ تعداد میں لینے والے افراد اور اونچے درجے کا عملہ اور ایجنٹ لوگ آمدنی کا بہت بڑا حصہ لے جاتے ہیں۔ عام شرکاء کو دو چار روپے مل گئے تو اس سے کونسا بڑا فرق پڑ سکتا ہے۔

صریح مفسدہ | اوپر کا تفصیلی تجزیہ یہ واضح کرنے کے لیے ہے کہ لائف انشورنس کا موجودہ نظام خالص اقتصادی لحاظ سے ایک نظامِ ظلم ہے جس کے پسِ پردہ اصل فائدہ تو وہی طبقہ اٹھاتا ہے جس کے پاس پہلے ہی ضروریات سے زیادہ دولت سمٹ رہی ہے اور حقیر اور برائے نام مفادِ عوام کا رکھا گیا ہے جسے نفسیاتی سحر کاری اور حسابی جادوگری سے عوام کے سامنے من موہنے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر ہم بہ حیثیت ایک سچے خدا پرست مسلمان کے اس مسئلے کو لیں تو ہمارے لیے اتنی بات جان لینا کافی ہے کہ سودی کاروبار کی ہر شکل کو خدا و رسول نے حرام ٹھہرایا ہے، کتابِ الٰہی اس بارے میں بالکل ناطق اور حدیثِ نبوی نہایت صریح ہے۔ کیوں نہ ہم بغیر کسی تاویل کے یہ تسلیم کر لیں کہ سود پر چلنے والا نظامِ بیمہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔

شائبۂ قمار | بعض لوگوں نے سود کے علاوہ نظامِ بیمہ کو قمار کی ایک شکل بھی قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہری حیثیت سے نظامِ بیمہ کے اصول و شرائط اب جس طرز میں ہمارے سامنے ہیں ان کے ہوتے ہوئے اس پر صریح قمار کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ میں اتنا کہوں گا کہ اس نظام کے مزاج کی کچھ نہ کچھ تخمیر ضرور قمار سے ہوئی ہے۔ مثلاً اوپر امریکہ کی لائف انشورنس کمپنیوں کے اعداد و شمار دیئے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء میں سود اور کاروبار کی کمائی انہیں تین ساڑھے تین ارب ڈالر سے کم ہوئی مگر وثیقہ داروں کو ساڑھے چار ارب ڈالر سے زیادہ ادائی کی گئی۔ علاوہ ازیں سرمایۂ محفوظ میں بھی اضافہ کیا جاتا رہتا ہے، نیز جائداد اثاثے بھی بڑھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ سالانہ پریمیم کی آمدنی نے تقریباً سوا دس ارب ڈالر کی امانتوں کا بار بڑھا دیا۔ ان وجوہ سے اس کاروبار میں پہلی ذمہ داریوں کا بار بعد میں

آنے والے سرمایہ پر بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی وجہ سے کوئی بیمہ کمپنی فیل ہو جائے (اس اندیشے کے سدباب کے لیے حکومتیں قانونی طاقت سے مناسب تدابیر عمل میں لاتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک مقررہ تناسب سے سرمایۂ محفوظ الگ کرا لیتی ہیں) تو نقصان کا بار آخری وثیقہ داروں پر جا پڑے۔ یہ کاروباری چکر چلتا رہے تو ٹھیک، اگر کسی بھی وجہ سے رک جائے تو ہزاروں افراد چوٹ کھا جائیں۔ جس بھی کاروبار میں کسی ایک فریق کا بار اچانک طور پر کسی دوسرے فریق کے سر جا پڑے اس میں شائبۂ قمار ضرور ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اوپر ایک بیمہ کمپنی کی سادہ سی اسکیم کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اسے ذہن میں تازہ کیجیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۶۰ ہزار افراد کو کوئی نفع نہیں ملتا، ۲۰ ہزار کو ان کے اندوختے پر برابر سرابر کا منافع مل جاتا ہے اور بقیہ ۲۰ ہزار اپنے حق سے زیادہ پا لیتے ہیں۔ ان تینوں گروہوں کا حق مختلف کیوں ہوا؟ اول الذکر کا کیا قصور ہے اور موخر الذکر نے معاشرے کی کونسی خدمت انجام دی ہے کہ ایک سے کما کر دوسرے کی نذر کر دیا گیا۔ گویا فیصلہ اتفاق کے ہاتھ تھا۔ یہی شائبۂ قمار ہے۔

اجتہادی فکر کو بیدار کیجیے آپ اگر میرے بنیادی نکات اور ان سے اخذ شدہ نتائج سے کچھ بھی اتفاق کریں تو پھر میں کہوں گا کہ موجودہ نظام بیمہ کو گہرے ناقدانہ ذہن سے دیکھیے اور آپ میں سے جو لوگ اس نظام کو چلانے میں شریک ہو کر اس کے مفاسد کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہوں، وہ اس کی ماہیت کو بے نقاب کریں۔ اسلام نے اصولِ ربوٰ اور سُودی کاروبار کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے اور اس نے ہمیں دنیا سے اس لعنت کا خاتمہ کرنے کے لیے کھڑا کیا ہے۔ ہمارے علمائے معاشیات، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ڈائرکٹروں اور فنی کارندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس فاسد نظام کا پورا پورا تجزیہ کریں اور اپنے اندر اجتہادی فکر کو بیدار کر کے بنکنگ اور انشورنس کے لیے بالکل نیا سسٹم تجویز کریں۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سُود پر چلنے والے نظامِ بیمہ کے خلاف علماء کی جو آخری صفِ مدافعت ہو سکتی تھی، ایک ایک کر کے ان کے فتوے اس کی حمایت میں لائے جا رہے ہیں[1]۔

---

[1] میرا اندازہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے بعض کارپرداز اور ایجنٹ خاص طریقے سے استفتا کی مغالطہ آمیز عبارت م

اسلامی اصولوں پر ریاست کے اجتماعی نظامِ بیمہ کے علاوہ بیمہ کاری اگر ہو سکتی ہے تو ایسی تنظیموں کے ذریعے جو امداد باہمی کے اصول پر قائم ہوں اور جن کو کوئی دوسرا سرمایہ دار عنصر اپنے کاروباری مفاد کے لیے استعمال نہ کرے۔ اس سے نیچے اتر کر اگر موجودہ طرز کی کمپنیوں کی گنجائش نکالی بھی جائے تو یہ بنیادی تبدیلی بالکل ناگزیر ہے کہ کاروبار سُود کے بجائے حصّہ داری نفع و نقصان پر چلایا جائے۔ یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ خود بینک کاری کا مجموعی نظام اصولِ ربٰو سے ہٹ کر حصّہ داری نفع و نقصان کے خطوط پر از سرِ نو استوار ہو جائے۔ یہ ایک بھاری اقدام ہو گا اور اسے عمل میں لانے سے قبل علمی و فکری لحاظ سے تیاری ضروری ہے۔

خاتمہ کے طور پر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیمۂ زندگی سے بڑھ کر آج ہمیں اپنے ایمان، اپنے ملّی شعور، اور اپنے لیے اجتہادی اندازِ فکر کا بیمہ کرانے کی ضرورت ہے۔

۴۔ مرتب کر کے علماء کے سامنے رکھتے ہیں اور علماء بہ حیثیت مفتی مجبور ہوتے ہیں کہ سوال کے مطابق جواب دیں۔ دورانِ گفتگو میں ماہر مستفتی نظامِ بیمہ کی ایسی معصوم تشریح کرتا ہے اور سُود کو اس خوبصورتی سے منافع کا ہم معنی قرار دیتا ہے کہ سنیئے تو داد دیجیے۔ چنانچہ یہ لوگ فتوے حاصل کرکے پھر ان کو رنگِ عموم دے کر عجیب طریق سے استعمال کرتے ہیں۔

رسائل و مسائل

اسلامی حکومت یا "فرقہ وارانہ حکومت"

سوال - مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرحوم کی تصنیف "نقشِ حیات" کی بعض قابلِ اعتراض عبارتوں کے بارے میں آپ سے پہلے خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے مولانا مرحوم کو بعض دوسری عبارتوں کی طرف توجہ دلائی تھی اور انہوں نے وعدہ فرمالیا تھا کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں قابلِ اعتراض عبارتوں کو یا تو بالکل تبدیل فرمادیں گے یا اس میں ایسی ترمیم فرمائیں گے کہ کسی کو ان کی طرف غیر اسلامی نظریات کے منسوب کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ مولانا کا جواب اس سلسلے میں درج ذیل ہے :

"یہ اعتراض کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا ارادہ کرنے والا اور صرف انگریزوں کا نکالنے والا میں قرار دیتا ہوں، بالکل خلافِ واقعہ اور تصریحات سے روگردانی ہے۔ بہرحال یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں اور اگر بالفرض کوئی عبارت ایسی ہے، جس کی دلالت مطابقی یہی ہے، دوسری توجیہ اس میں نہیں ہو سکتی تو وہ غلط ہے۔ ہندوستان کی حکومت کے شرمناک کارناموں سے مجھے انکار نہیں، پھر میں کس طرح اس کو دارالاسلام قرار دے سکتا ہوں ؛ لیکن "فرقہ وارانہ حکومت اور سیکولر اسٹیٹ کے درمیان بھی تو ایسی صورتیں ہیں جن کو اسلام قبول کر سکتا ہے۔ مغلیہ حکومت کو دیکھیے اور غور فرمائیے"

مولانا مرحوم کے جواب سے اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ حضرت مولانا دارالکفر کو دارالاسلام نہیں سمجھتے، مگر اس کا افسوس بھی ہوا کہ میں "نقشِ حیات" کی تصریحات اور مولانا کے اس جواب میں کوئی مطابقت نہیں پاتا۔ میں اس سلسلہ میں ابھی مزید خط و کتابت کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔"

جواب: یہ دیکھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی کہ مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کم از کم ہندوستان کی موجودہ حکومت کو تو دارالاسلام قرار نہیں دیتے اور وہاں کی موجودہ حکومت کے "شرمناک" کاموں سے انہوں نے اظہارِ براءت فرمایا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے بھی محسوس کیا ہے، ان کی کتاب "نقشِ حیات" کی ایک دو نہیں متعدد عبارتیں ایک بہت ہی گمراہ کن نظریہ پیش کرتی ہیں۔ اس لیے ایک مجمل تردید یا استدراک کے بجائے اس نظریہ کی مفصل تردید اور اس سے کلی براءت کی ضرورت ہے۔ مولانا مرحوم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جہاد کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ بس ہندوستان اس بدیشی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک ہو جائے اور "اس کے بعد ہندو اور مسلمان مل کر بادشاہت کے لیے جس کو مناسب سمجھیں منتخب کریں" حالانکہ اس کے ثبوت میں حضرت شہید کے جس خط کو وہ پیش کرتے ہیں، وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک حکومت کے تخیل سے بالکل خالی ہے۔ پھر وہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات کا، جنہیں خود انہوں نے نقل کیا ہے، بالکل الٹا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ "اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور ازروئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں"۔ اس پر بھی وہ بس نہیں کرتے بلکہ یہ عجیب و غریب دعویٰ کرتے ہیں کہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں جن علماء نے بھی اصلاحِ احوال کی کوشش کی "ان کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن و امان، سکون و اطمینان، ظلم و جور کی بیخ کنی، اور خلقِ خدا کی عام رفاہیت و بہبودی تھا، ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی"۔ اس سے آگے بڑھ کر انتہائی گمراہ کن بات جو انہوں نے لکھی ہے، اور غضب یہ ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی طرف بالکل غلط طور پر منسوب کر کے لکھی ہے، وہ یہ ہے:

"اعلاءِ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک "فرقہ وار" گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے، بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ

برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔" (نقشِ حیات جلد دوم ص۵۱)

یہ عبارت جس سے اسلامی حکومت کے تخیل ہی کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ایک ایسا نظریہ پیش کرتی ہے جو اسلامی نظریۂ ریاست کی بالکل ضد ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے آباد ہوں وہاں اسلام کی حکومت قائم کرنا اگر غلط نہیں تو مرجوح طریقہ ضرور ہے۔ ایسی حکومت کو مولانا اسلامی حکومت سمجھنے کے بجائے بار بار ایک "فرقہ وار حکومت" کے نام سے یاد فرماتے ہیں، اور برادرانِ وطن کو محکوم بنا کر خود حاکم بن جانا، ان کی نگاہ میں اگر زیادتی نہیں تو کم از کم نامناسب تو ہے ہی۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے افضل اور اعلیٰ طریقہ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم کی مشترک حکومت بنائی جائے، جو بہر حال اسلامی حکومت نہ ہوگی، اور صرف فضائلِ اخلاق سے غیر مسلموں کا دل موہنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کی پوزیشن پھر کیا ہے، جس میں غیر مسلموں کی آبادی ۸۰ - ۹۰ فی صدی سے کم نہ تھی، مگر اس کے باوجود "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم کر کے مسلمان خود حاکم بن بیٹھے تھے، اور غیر مسلموں کو سیاسی اقتدار میں شریک کرنے کے بجائے اپنا محکوم انہوں نے بنا لیا تھا؛ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی زد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پڑتی ہے جنہوں نے "برادرانِ وطن" کو اقتدار میں شریک نہیں کیا تھا اور اسلام کی خالص "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم کر دی تھی۔ کیا مولانا یہ فرمائیں گے کہ حضورؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ کا بہتر اور زیادہ مؤثر طریقہ چھوڑ کر ایک کمتر درجہ کا طریقہ اختیار فرمایا؟ یہی وہ باتیں ہیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہندو اقتدار کی آمد پر اس کے ساتھ مصالحت کرنے میں مولانا حسین احمد صاحب مرحوم جتنی دُور چلے گئے ہیں اتنی دُور تو انگریزی اقتدار کے ساتھ مصالحت کرنے میں سرسید اور اس کے ساتھی بھی نہ گئے تھے۔ یہ خیالات تو اسلام کے متعلق مسلمانوں کے اصولی نقطۂ نظر تک کو بدل ڈالیں گے اور ایک مسلمان ان کو قبول کرنے کے بعد رسولؐ و اصحاب رسول صلوات اللہ علیہم اجمعین کے مقابلے میں ہندوستانی سیکولرزم کے بانیوں کو زیادہ انصاف پسند سمجھنے لگے گا۔

مولانا مرحوم کی یہ مداہنت میری نگاہ میں ایک بہت بڑا مظلمہ ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انہیں اس پر معاف فرمائے اور عامۃ المسلمین کو ایسے غلط نظریات کے بُرے اثرات سے بچائے۔

بیع سَلَم

سوال:- آج کل کاروبار اور تجارت میں پیشگی سودوں کا رواج عام ہے یعنی بعض اجناس وغیرہ کا نرخ پہلے طے کر لیا جائے اور لین دین بعد میں ہوتا ہے بعض علماء اسے بیع سَلَم قرار دے کر جائز ٹھہراتے ہیں، لیکن بیع سَلَم کی تعریف عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ براہ کرم اس کی تعریف اور شرائط وغیرہ واضح طور پر تحریر کریں تاکہ خرید و فروخت کے معاملات میں جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور لاعلمی کی بنا پر کوئی غلط یا ممنوع کاروائی صادر نہ ہونے پائے۔

جواب:- شریعت میں بیع سَلَم سے مراد ایسی خرید و فروخت ہے جس میں قیمت تو نقد ادا کر دی جائے لیکن اس کے عوض مال ایک متعین مدت کے بعد وصول کیا جائے۔ اس کے جائز اور صحیح ہونے کے لیے حدیث اور فقہ کی رُو سے جو شرائط لازم ہیں، اُن میں سے اہم ترین شرائط، جن پر قریب قریب اتفاق ہے ذیل میں درج ہیں:

(۱) مال اور اس کی قیمت کا ٹھیک ٹھیک اور واضح تعین کیا جائے۔ جنس، اس کا وزن، اس کی نوعیت اور قسم وغیرہ کی ایسی تشریح کر دی جائے کہ بعد میں اشتباہ یا اختلاف یا نزاع کی گنجائش نہ رہے۔

(۲) مال ایسا ہونا چاہیے کہ اس نمونے یا اس قسم کا مال سودا کرتے وقت بازار میں بسہولت دستیاب ہو، یا عنقریب دستیاب ہو جانے کی توقع ہو۔

(۳) جتنی مدت کے بعد مال وصول ہو گا، اس مدت کا بھی ٹھیک تعین ہو۔

(۴) قیمت بھی بالکل معین اور مقرر ہو اور سودا کرتے وقت پیشگی ادا کر دی جائے۔

(۵) سودے میں مال کی واپسی اور بیع کی منسوخی کی شرط نہ ہو۔

(۶) اگر مال کے حمل و نقل میں دقت اور مصارف کا سامنا ہو تو پھر اس مقام کا بھی تعین ضروری ہے جہاں وہ مال مشتری کے سپرد کیا جائے گا۔

مطبُوعات

تزکیۂ نفس تالیف مولانا امین احسن اصلاحی۔ شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۳۱۲۔ طباعت اور کتابت کا معیار عمدہ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ایک طرف معلّم کتاب و حکمت تھے، وہاں وہ مُزکّی اور مُربّی بھی تھے۔ انہوں نے اپنے ماننے والوں کے دلوں کو نفسانیت کی ساری آلائشوں سے پاک کر کے، ان میں اخلاص اور بے لوثی کا رنگ بھرا۔ حضورؐ نے جتنا زور معاشرے کی اصلاح پر دیا اتنی ہی توجہ انہوں نے تعمیر سیرت پر صرف کی۔ کیونکہ اجتماعی اصلاح و ترقی کا کوئی پروگرام اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اجتماعیت کی بنیادی اکائی یعنی فرد کی اصلاح نہ کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ہر دور میں پاک باز انسانوں کا ایک گروہ اس طرف ضرور متوجہ رہا۔ لیکن اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ تزکیۂ نفس کے اس اہم کام میں غیر مسلم اقوام کے اختلاط کی وجہ سے بعض ایسے طریقے بھی شامل ہو گئے جو حضورؐ اور ان کے جلیل القدر صحابہ سے ثابت نہیں۔ اس چیز کی ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اللہ کا کوئی بندہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کر کے بتائے کہ اسلام میں تزکیۂ نفس کا مفہوم کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس اہم فرض کی بجا آوری مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے ذمہ لی۔ زیرِ تبصرہ کتاب مولانا کے تربیتی لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے جماعت اسلامی کی تربیت گاہوں میں تزکیۂ نفس کے عنوان سے دیئے تھے۔ اس حصہ میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے اُن میں چند ایک یہ ہیں: دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد تزکیہ ہے، تزکیۂ علم، تدبر قرآن اور اس کے آداب و شرائط، اسوۂ حسنہ، حجاباتِ علم، کتمانِ علم کے اسباب اور اس کا علاج وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس کتاب میں مولانا نے تزکیۂ نفس کے متعلق ایک بہت بڑی غلط فہمی یعنی یہ کوئی راز کی چیز ہے، کو بھی

دفن کیا ہے۔ انہوں نے قرآن اور حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ "تزکیۂ نفس کوئی ایسا پُر اسرار علم نہیں جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال لوگ ہی ہوتے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے"۔

پوری کتاب نہایت ہی مفید اور عمدہ ہے اور اس کو پڑھ کر ایک انسان اپنی بہت کچھ اصلاح کر سکتا ہے۔ ہم اپنے قارئین سے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس سے استفادہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

| اسبابِ فسادِ امت | تالیف مولانا میاں محمد حافظ، نوشہرہ، ضلع شاہ پور ناشر ادارہ عروج اسلام خوشاب ضلع سرگودھا قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ صفحات ۴۴ طباعت اور کتابت کا معیار گوارا۔

وہ شخص جس نے پرویز صاحب کی تحریروں کا سرسری سا مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ ان سب میں اسلام کی مادی تعبیر کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حشر و نشر، وحی و الہام، خلافت اور رسالت، الغرض دین کے سارے مفہوم کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اس چیز کو وہ سب سے بڑی خدمتِ اسلام سمجھتے ہیں۔ اس وقت جب کہ یہ تحریک ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اس کے خطرناک نتائج سے عوام کو پوری طرح شناسا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہمیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ اگر خدانخواستہ اسے برگ و بار لانے کا پورا موقع ملا، تو یہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم خطرہ ہوگی۔ اس لیے جو معقول سعی بھی پرویز صاحب کے باطل نظریات کی تردید کرنے کے لیے کی جائے وہ مبارک ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے پرویز صاحب کی کتاب "اسبابِ زوالِ امت" کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ "مصلحِ قوم" اسلام کے بارے میں کس قسم کی گمراہیاں پھیلا رہا ہے۔ مولانا کا اندازِ بیان سلیس اور رواں ہے۔ لیکن ہمیں

اندیشہ ہے کہ استدلال کا جو طرز مصنف نے اختیار کیا ہے شاید وہ اُن ذہنوں کو اپیل نہ کر سکے جو پرویز صاحب سے متاثر ہیں۔ اس ایک کمی کے باوجود فاضل مصنف کی کوشش بہر حال لائقِ ستائش ہے خصوصاً اُن نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں جن میں وہ کام کر رہے ہیں۔

اقبال اور عشقِ رسالتمآب تالیف سید محمد عبدالرشید فاضل، پروفیسر اردو کالج کراچی۔

ناشر: تنویراتِ علم و ادب۔ ۵۰۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۔ قیمت مجلد ۲ روپے۔ غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے صفحات ۱۸۴۔

انگریزوں کے دورِ تسلط میں، اس ملک میں اسلام کے خلاف جو مختلف سازشیں کی گئیں اُن میں سب سے ناپاک سازش حضور سرورِ کائنات کے خلاف تھی۔ ایک طرف یورپ میں حضور کی ذات کے خلاف افترا پردازیوں کا ایک نہایت ہی شرمناک سلسلہ شروع کیا گیا اور دوسری طرف ہندو پاک کے مسلمانوں میں حضور کے بارے میں مختلف بدگمانیاں پھیلائی گئیں۔ چنانچہ ان ناپاک کوششوں کے نتیجہ میں ہی یہاں حضور کے بارے میں بعض نہایت ہی گمراہ کن خیالات پھیلنے شروع ہوئے۔ کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو محض ماضی کی ایک قابلِ احترام شخصیت کی حیثیت دے دی۔ کچھ فتنہ سازوں نے ایک نئی نبوت کا ڈھونگ رچا لیا، بعض نے حضور کے منصبِ رسالت کو اتنا گرایا کہ انہیں کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک قابلِ اعتماد ہرکارے کی پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔ ان سارے فتنہ پردازوں کی زد حضور پر اس لیے پڑتی ہے کہ ایک مسلمان کا ایمان حضور کی محبت سے قائم رہتا ہے۔ اگر آنحضرت کے ساتھ ہمارے تعلق میں کسی قسم کی کمی آ جائے تو پھر دین خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس خطرہ کو پوری طرح بھانپتے ہوئے اس طرف توجہ دی اور اپنے مخصوص اندازِ بیان میں بتایا کہ مسلمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا ہے اور ان سے محبت کتنی ضروری ہے۔ جس دل میں حضور کی محبت نہیں وہ ایمان کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے اس عاشقِ رسولؐ کے رسالتمآب سے تعلق کو بیان فرمایا ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر شگفتہ اور سلیس ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اُس

ظلم عظیم کا ایک ہلکا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو منکرینِ حدیث اقبالؒ کو اپنی صف میں شامل کر کے اس پر ڈھاتے ہیں۔

سیرتِ پاک مرتبہ جناب بشیر محمد شارق۔ ناشر: کارخانہ تجارتِ کتب بالمقابل آرام باغ فریرہ۔ ڈ کراچی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ صفحات ۱۹۲۔

اس مختصر کتاب میں بچوں کے لیے نہایت ہی سہل انداز میں سرورِ کونین کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کا اندازِ بیان آسان ہونے کے ساتھ بڑا دلچسپ بھی ہے۔ ہماری نظر میں یہ کوشش جس مقصد کے لیے کی گئی ہے وہ کافی حد تک کامیاب ہے۔

اعلان

دفتر ترجمان القرآن میں پچھلے سالوں کے چند پرچے برائے فروخت موجود ہیں۔ شائقین کی سہولت کے لیے ان کی قیمت میں پچاس فیصد رعایت کر دی گئی ہے۔ فائل رکھنے کے خواہشمند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔

۱۔ جمادی الاخریٰ سنہ ۷۴ھ۔ مطابق مارچ سنہ ۵۵ء۔ جلد ۴۳۔ عدد ۶

۲۔ رجب سنہ ۷۴ھ مطابق اپریل سنہ ۵۵ء۔ جلد ۴۴ " ۱

۳۔ شعبان، رمضان سنہ ۷۴ھ " مئی سنہ ۵۵ء " ۴۴ عدد ۲ و ۳

۴۔ شوال سنہ ۷۴ھ " جون سنہ ۵۵ء " ۴۴ " ۴

۵۔ ذی قعدہ سنہ ۷۴ھ " جولائی سنہ ۵۵ء " ۴۴ " ۵

۶۔ ذی الحجہ سنہ ۷۴ھ " اگست سنہ ۵۵ء " ۴۴ " ۶

۷۔ محرم سنہ ۷۵ھ " ستمبر سنہ ۵۵ء جلد ۴۵ " ۱

۸۔ صفر سنہ ۷۵ھ " اکتوبر سنہ ۵۵ء " ۴۵ " ۲

۹۔ ربیع الثانی سنہ ۷۵ھ " دسمبر سنہ ۵۵ء " ۴۵ " ۴

۱۰۔ جمادی الاولیٰ سنہ ۷۵ھ " جنوری سنہ ۵۶ء " ۴۵ " ۵

۱۱- جمادی الاخریٰ	سنہ ۷۵ھ	مطابق	فروری سنہ ۵۶ء	جلد	۴۵	عدد	۶
۱۲- شعبان	سنہ ۷۵ھ	"	اپریل سنہ ۵۶ء	"	۴۶	عدد	۲
۱۳- شوال	سنہ ۷۵ھ	"	جون سنہ ۵۶ء	"	۴۶	عدد	۴
۱۴- محرم صفر	سنہ ۷۶ھ	"	اکتوبر سنہ ۵۶ء	"	۴۷	عدد	۱، ۲
۱۵- ربیع الاول	سنہ ۷۶ھ	"	نومبر سنہ ۵۶ء	"	۴۷	"	۳
۱۶ ربیع الثانی	سنہ ۷۶ھ	"	دسمبر سنہ ۵۶ء	"	۴۷	"	۴
۱۷- جمادی الاولیٰ	سنہ ۷۶ھ	"	جنوری سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۵
۱۸- رجب	سنہ ۷۶ھ	"	اپریل سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۱
۱۹- شعبان، رمضان	سنہ ۷۶ھ	"	جون سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۲ و ۳
۲۰- شوال	سنہ ۷۶ھ	"	جولائی سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۴
۲۱- ذی قعدہ	سنہ ۷۶ھ	"	اگست سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۵
۲۲- ذی الحجہ	سنہ ۷۶ھ	"	ستمبر سنہ ۵۷ء	"	۴۸	"	۶

محرم سنہ ۷۷ھ مطابق اکتوبر سنہ ۵۷ء جلد ۴۹ عدد ۱ تا رمضان سنہ ۷۷ھ مطابق جون سنہ ۵۸ء جلد ۵۰ عدد ۳ - ۸ آنے فی پرچہ کے حساب سے اور ایجنٹوں کو ان کی ایجنسی کمیشن کے حساب سے بھیجے جائیں گے۔

(نوٹ) ربیع الثانی سنہ ۷۷ھ مطابق جنوری سنہ ۵۸ء۔ ختم ہے۔

چراغ الدین

مینجر رسالہ ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

(بقیہ اشارات)

من اطاع محمداً فقد اطاع الله	جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت
ومن عصیٰ محمداً فقد عصی الله و	کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی
محمد فرق بین الناس۔	کی۔ (اللہ کے ماننے اور نہ ماننے والے) لوگوں کے
(بخاری)	درمیان محمدؐ ہی نشانِ امتیاز ہیں۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہ مصطفےٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگ کافرے میر

تفہیم القرآن (جلد سوم)، کا ایک حصہ

تفسیر سورۃ نور (مع نقشہ جغرافیہ و انڈکس)

جسے فائدہ عام کے لیے الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اسلامی نظامِ معاشرت کے متعلق وہ تعلیمات جو مسلمانوں کی اخلاقی و اجتماعی زندگی کے لیے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پردہ، استیذان، قذف، اور زنا سے متعلق قوانینِ شریعت پر مبسوط بحث۔ قرآن، حدیث، اور فقہ کے باہمی ربط و تعلق کی صحیح نوعیت اور اس ضمن میں جدید شبہات کا شافی جواب۔ اسلامی قانون اور نظامِ معاشرت کے متعلق ایسی معلومات جو اردو، انگریزی ہی میں نہیں خود عربی زبان میں بھی کہیں یکجا مرتب نہیں ملتیں۔ وکلاء، حاکمانِ عدالت، طلبائے قانون اور اساتذہ کے لیے اسلام کے معاشرتی نظام کی ایک جامع دستاویز۔

سورۂ نور تین اقسام کی تیار ہوئی ہیں۔ فرمائش میں مطلوبہ قسم کی وضاحت فرمادیں۔

کاغذ کرنافلی سفید	مجلد عام	ہدیہ تین روپے ۱۲ آنے		محصول
” ولائتی ”	”	” چار روپے ۸ ”		ڈاک
” ولائتی سفید۔ خصوصی جلد لیپ کور		” ۶ روپے		آٹھ آنے

فرمائش بھیجنے کا پتہ: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور

دعوت دین اور اسکا طریق کار

از

مولانا امین احسن اصلاحی

موجودہ زمانے میں جسطرح دین کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں ادھورا اور ناقص ہے اسی طرح دین کی وحدت و تبلیغ کا مفہوم بھی محدود اور غلط ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں دین کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے سامنے رکھا ہے اور اس حیثیت سے اس جد و جہد کے تمام تقاضوں اور اسکے تمام مراحل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو اس نظام کو برپا کرنے کے لئے اختیار کرنی پڑتی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی معیشیت کی ضرورت، انبیاء کا طرز خطاب، دعوت دین کے مدارج اور اسکا طریق کار، مروجہ طریقہ تبلیغ کی خامیاں اور انبیاء کرام کا طریق تربیت۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اب چھوٹے سائز پر چھپ کر آگئی ہے۔

ضخامت ۳۱۲ صفحات، دیدہ زیب سرورق قیمت ۳-۱۲-۰

پاکستانی عورت دوراہے پر

از

مولانا امین احسن اصلاحی

”مغرب کی اندھی تقلید جسکی طرف اس وقت پاکستان کی عورتیں دھکیلی جا رہی ہیں صرف ہمارے دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس سے ہماری دنیا بننے کی بھی کوئی توقع نہیں ہے“ مولانا امین احسن اصلاحی نے نہایت خوبی کے ساتھ اور بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ اس کتاب میں یہی حقیقت واضع کی ہے۔ اور صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیکر بتایا ہے کہ مغرب زدہ طبقہ پاکستانی عورت کو کس راہ پر لے جانا چاھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے اسکو کس راہ پر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ (چھپ کر آگئی ہے)۔

ضخامت ۲۷۲ صفحات دیدہ زیب سرورق قیمت ۳-۸-۰

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

و سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی زیر مسلم مسجد

چوک انار کلی ۔ لاہور

اسلام اور جدید معاشی نظریات

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ مولانا مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے سود حصہ اول اور حصہ دوم کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں - اب مولانا نے ان دونوں حصوں کے بعض ابواب کو نئے سرے سے ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے - جس میں موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر - جدید نظام سرمایہ داری ، سوشلزم اور کمیونزم کا تجزیہ ، ان فاسد نظریات کا ردِ عمل ، اسلامی نظم معشیت کے بنیادی اصول اور جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل پیش کیا گیا ہے -

موجودہ معاشی نظریات اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید اور ضروری ہے -

(زیر طبع)

حیات طیبہ

از

ابو سلیم محمد عبدالحی

کون نہیں جانتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کی حیات طیبہ ایک ایسا قابل تقلید نمونہ ہے جو

* تمدنی فلاح کا واحد راستہ ،
* معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظام کے قیام کی کامیاب ترین تدبیر ،
* اخلاق و انسانیت کا مکمل سبق ،
* داعیان حق کے لئے دائمی مشعل راہ ،
* تربیت و تزکیہ کا عملی پروگرام ،
* رضائے حق کے حصول کا واحد راستہ ----- اور ان سب سے بڑھ کر آخرت کی کامیابی کی تنہا ضمانت ہے -

ان دعووں کا ثبوت آپ کو اس کتاب میں ملیگا - (زیر طبع)

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

و سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی زیر مسلم مسجد

چوک انار کلی - لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس - لاہور